ایمان لاؤ) اور آنحضرت صلعم کو آپ کے اس شدید اضطراب پر تنبیہ کی گئی ہے جو کفار و مشرکین کو اسلام کی جانب بلانے کے لیے آپ کے اندر پایا جاتا تھا، اور جس کی وجہ سے آپ کی توجہ مسلمانوں کی اصلاح و تزکیہ کی طرف سے کم ہوجاتی تھی، اس بنا پر اس وقت جبکہ خود مسلمان اسلام پر پوری طرح عمل پیرا نہیں ہیں ان کی اصلاح و تبلیغ کے کام کو غیر ضروری نہیں کہا جاسکتا ہے، دعوت و تبلیغ میں حکمت، موقع و حالات کی رعایت اور الاہم فالاہم کو مدنظر رکھنا ضروری ہے، علاوہ ازیں غیر مسلموں میں اسلام کی تبلیغ اسی وقت زیادہ کارگر ہوسکتی ہے جب مسلمان خود اسلام کے سچے حامل ہیں، یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے بعض حلقے غیر مسلموں سے زیادہ خود مسلمانوں کی اصلاح و تبلیغ کو مقدم سمجھتے ہیں، ورنہ وہ بھی غیر مسلموں میں اسلام کی دعوت کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں، تاہم جماعت اسلامی کی اس میدان میں بھی سبقت قابل ستائش ہے۔

صیانۃ الحدیث حصہ دوم: مرتبہ مولانا عبدالرؤف رحمانی جھنڈانگری، تقطیع خورد، کاغذ معمولی کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۲۰۰، قیمت چھ روپیے، پتہ: مصنف کیر آف خان کلاتھ ہاؤس، ڈاکخانہ رام رت گنج، ضلع بستی۔

یہ اس کتاب کا دوسرا حصہ ہے، اس میں طبقہ تابعین و تبع تابعین کے ممتاز محدثین کی ان مساعی کا ذکر ہے جو احادیث کی حفاظت و صیانت اور جمع و تدوین کے سلسلہ میں انھوں نے انجام دی ہیں، لائق مصنف نے اس ضمن میں ان بزرگوں کے حدیث نبوی سے شغف، حفظ و ضبط میں کمال، نقل و روایت میں مکمل احتیاط اور عدالت و دیانت کے مستند واقعات بھی بیان کیے ہیں، تابعین میں امام نافعؒ، ہمام بن منبہؒ، قتادہؒ، امام شعبیؒ، امام زہریؒ، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اور امام شعبہؒ وغیرہ اور تبع تابعین میں ابن جریج، امام مالک، عبداللہ بن مبارک، وکیع بن جراح، عبدالرحمن بن مہدی، معمر بن راشد، سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، اسحاق بن راہویہ، علی بن مدینی، امام ابو زرعہ، یحییٰ بن معین، امام احمد ابن حنبل اور کئی دوسرے بزرگوں کا ذکر ہے، آخر میں ائمہ صحاح میں امام بخاری، امام مسلم، امام ابوداؤد، امام نسائی اور امام ترمذی کا تذکرہ ہے، ان بزرگوں کے مختصر ترجمہ کے علاوہ اہم اور ممتاز کتب حدیث کی خصوصیات بھی تحریر کی ہیں، اس مفید کتاب سے ائمہ حدیث کی روایات و احادیث کے اخذ و بیان میں اہتمام و بلیغ کا اندازہ بھی ہوگا اور منکرین حدیث کے بعض بے بنیاد الزامات کی تردید بھی ہوگی۔ "ض"

جلد ۱۲۹ ماہ شعبان المعظم ۱۴۰۲ھ مطابق ماہ جون ۱۹۸۲ء عدد ۶

مضامین

شذرات

یکم شعبان ۱۴۰۲ھ کو حضرت مولانا محمد زکریا محدّث سہارنپوری کا وصال ستاسی سال کی عمر میں مدینہ منورہ میں ہوگیا، جہاں شیدائیوں اور فدائیوں کے بے پناہ ہجوم نے اُن کے جنازہ کی نماز پڑھی، اور اسی مقدس سرزمین میں سپردِ خاک کئے گئے، جس کی آرزو زندگی بھر فرماتے رہے،

~~~~~~

وہ چودہویں صدی ہجری میں علمائے سلف کی ایک بے مثال یادگار تھے، اُن کی تدفین کے ساتھ اسلام کے اس دور کی ایک بے قرار عبقریت کی نظرِ حکیمانہ، اسرارِ محرمانہ، جذبِ عارفانہ اور پھر دینی علوم کی پشتیبانی، عالی استعداد کی جلوہ سامانی، تحریر کی صاعقہ پاشی اور قلم کی برق وشی بھی تہِ خاک ہوگئی، اب جب وہ آغوشِ رحمتِ الٰہی میں ہیں، اُن کو اُن کے معتقدین ملک العلما، سلطان الفضلا، منہاج المتقین، مہبط الانوار اور شمس الفقراء کی حیثیت سے یاد کرکے ان کی دائمی جدائی پر آنسو بہائیں گے، ان کے جلوۂ صد رنگ پر آئندہ بہت کچھ لکھا جائیگا، وہ دینی اور روحانی علوم کے دریا میں کبھی مثلِ موج اُبھر کر کبھی اس کے ساحل سے گذر کر کبھی اُس کے سینے میں اُتر کر اُن کے راز کو جس طرح فاش تر کرتے رہے، اس پر معلوم نہیں کیا کچھ قلم بند ہوتا رہے گا، انھوں نے خدا جانے کتنے اوراق پر اسرارِ الٰہی کے حقائق اور انوارِ الٰہی کے دقائق کو آشکار کیا، اُن کی ان گنت تصانیف کی روحانی، مذہبی، نظری، فکری، اخلاقی اور دعوتی تعلیمات سے برابر عبرت و بصیرت کے درس حاصل ہوتے رہیں گے،

~~~~~~

تعلیم مظاہر العلوم سہارنپور میں پائی، اور وہیں ایک عرصہ تک درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا، اپنے والد بزرگوار سے مجتہدانہ دماغ پایا تھا، اسی لئے طالب علمی ہی کے زمانے سے قرآن مجید، حدیث مقدس اور فقہ کا مجتہدانہ مطالعہ کرتے رہے، قرآن پاک کو سمجھنے اور سمجھانے میں اُن کی جو نظر لغت، نحو، صرف، اشتقاق، علم بیان، علم بدیع، علم قرأت، علم عقائد اور شانِ نزولِ آیاتِ کریمہ پر رہی وہ کم علما کی رہی ہوگی،

اسی طرح حدیث کو سمجھنے کے لئے فرماتے کہ محدثیت اور شیخت کے بجائے سلف صالحین کی جانکاہی کی ضرورت ہوتی ہے، انھوں نے خود اس جانکاہی کا اعلیٰ ترین نمونہ پیش کیا، بہت بڑے محدث ہوئے حدیث کا درس دینے میں یگانۂ روزگار تسلیم کئے گئے، عربی میں ترمذی موطا اور بخاری شریف کی مختلف جلدوں میں جو شرحیں لکھی ہیں وہ اسلامی ممالک میں بھی شمعِ ہدایت بنی ہوئی ہیں، وہ بہت بڑے فقیہ بھی تھے، وہ اس کے قائل تھے کہ فقہ کا ماخذ قرآن پاک، سنت مطہرہ، اجماع اور قیاس ہے اس لئے ایک فقیہ کے لئے ان چیزوں کو معلوم کرنا ضروری ہے جو قرآن مجید اور حدیث پاک میں ہے،

~~~~~~

ان علوم کے حصنِ حصین میں بیٹھ کر وہ سلوک و طریقت کی طرف بھی مائل ہوئے حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ کی صحبت میں تقویٰ حاصل کیا، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے فکرِ حکیمانہ اخذ کی، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے مجاہدہ کا درس لیا، حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ سے تواضع اور انکسار سیکھا، اپنے چچا حضرت مولانا محمد الیاسؒ سے مذہبی مراسم کی نگہبانی کی وراثت ملی، اور اپنے مرشد حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ سے فنِ حدیث سے شغف و انہماک کے علاوہ عشقِ الٰہی، محبتِ رسول، سوز، گداز، صدق، صفا، زہد، توکل، محبت، خود انکاری اور ایثار کی دولت پائی، یہ وہ بزرگانِ دین تھے جن کے بارہ میں خود حضرت مولانا کا خیال تھا کہ ع :- انہی کے اتقا پر ناز کرتی ہے مسلمانی،

رشد و ہدایت کی مسند پر متمکن ہوتے تو انابت ہو یا عبادت، زہد ہو یا ریاضت، مجاہدہ ہو یا تفکر، استغنا ہو یا قناعت، بے نیازی ہو یا اخلاص، عشقِ الٰہی ہو یا محبتِ رسول، ان سب کے مدارج طے کر کے اٹھتے بیٹھتے اور سوتے جاگتے باری تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کو دیکھ کر محو اور متحیر رہتے، اور دنیا کو اپنی انگلیوں کے حلقہ ہی میں رکھنا پسند کیا، ایسے ہی بزرگانِ دین کے لئے اقبال نے کہا ہے، ؎

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی

~~~~~~

ان کی خدمتِ بابرکت میں رشد و ہدایت کیلئے جو بھی حاضر ہوا اس نے محسوس کیا کہ

جنھیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو — ید بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

اور وہ خود اپنے مریدوں کو بس یہی تعلیم دیتے رہے، ع :- دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں،
وہ سہارنپور میں رہتے یا مدینہ منورہ میں رہ کر گنبد خضراء کے دیدار سے مشرف ہوتے یا ڈربن پہنچ کر اپنے مشتاقوں کے دیدار کی تشنگی
بجھاتے یا لندن میں قیام کر کے اپنی فقر کی دولت کو عام کرتے یا جہاں بھی جا کر اخلاق نبوی، افعال نبوی اور اقوال نبوی
کی تعلیم دیتے، ہر جگہ بالالتزام ذکر الٰہی کی مجلس گرم رکھتے، وہ روحانی منظر کیسا ایمان پرور ہوتا جب وہ خود جلوہ افروز ہوتے،
ان کے ارد گرد ان کے حلقہ بگوشوں کی ایک باوقار اور سرشار جماعت ہوتی جس کے دل کے اندر سے لا الٰہ الا اللہ کی نغمہ ریز
صدا بلند ہوتی، اس وقت ایسا معلوم ہوتا کہ ع :- نہ ہے زماں نہ مکاں لا الٰہ الا اللہ،

اس کم سواد راقم کے لئے اُن کے گوناگوں کمالات پر کچھ بھی لکھنا اس کے بس کی بات نہیں

دامانِ نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار — گلچیں بہار تو ز داماں گلہ دارد

وہ ایک بلند پایہ اور باکمال محدث ہونے کے باوجود عوام و خواص میں قدوۃ السالکین ہی کی حیثیت
سے مشہور ہوئے، اب وہ عالم بالا میں تشریف فرما ہیں، وہاں اگر محدثین کے جلو میں نظر آ رہے ہوں گے تو اقطاب الاسلام
سلاطین الطریقت، سراج الاولیاء، تاج الاصفیاء کی صف میں بھی دکھائی دے رہے ہوں گے، قدوۃ السالکین کی حیثیت
سے وہ یہ پیام چھوڑ گئے ہیں کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ احسان کیا چیز ہے تو آپ
نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو کہ جیسے اس کو دیکھ رہے ہو، اسی احسان کا ایک نام طریقت
یا سلوک یا تصوف ہے، اللہ تعالیٰ کی رضامندی میں بالکلیہ مصروف ہو جانے، علم دین پر قوت یقین رکھنے
اور جو کچھ حدیث میں ہے اس پر عمل کرنے کا نام اخلاق تصوف ہے،

اسی پر عمل کر کے اُن کے معتقدین، کو ان کی روح پر فتوح کو خوش رکھنا ہے، گو یہ یقین کامل ہے کہ ان کی
دینی فضیلت، روحانی عظمت، تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب کی وجہ سے اُن کے مرقد مبارک پر انوار الٰہی اور
تجلیات ایزدی کی بارش برابر ہوتی رہے گی، آمین ثم آمین،

مقالات

مستشرقین اور علوم اسلامیہ

از

شیخ نذیر حسین، مدیر اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

یورپ اور عالم اسلام کے باہمی تعلقات صدیوں سے قائم ہیں، یہ تعلقات شروع میں خالص تجارتی، دینی اور علمی تھے، بیت المقدس عیسائیوں کا دینی اور روحانی مرکز ہے، اس لیے فلسطین جانے والے عیسائی زائرین کی رہنمائی کے مختلف اوقات میں ہدایت نامے، سفرنامے اور عربی بول چال کی کتابیں لاطینی رسم الخط میں لکھی گئیں، ازمنۂ وسطیٰ میں اندلس ہی تعلیم و تدریس کا مرکز تھا، لہٰذا اطالوی اور فرانسیسی طلبہ اشبیلیہ اور قرطبہ کا رخ کیا کرتے تھے، ان کے طفیل کندی، فارابی، ابن سینا اور ابن رشد کی بہت سی کتابیں لاطینی زبان میں منتقل ہوئیں، یورپ میں ویٹیکن یا پائے روم کا صدر مقام اور عیسائیت کی تعلیم و تدریس کا بڑا مرکز ہے، یہاں کے فارغ التحصیل دینی مناصب پاتے تھے اور اپنے اپنے ملکوں میں جا کر تعلیم و تعلم کا فریضہ بھی انجام دیتے تھے، یہ طلبہ عربی زبان سے بھی بقدر ضرورت واقف ہوتے تھے۔

عبرانی اور عربی زبانوں کی تحصیل کی طرف رغبت اور شوق کا ایک بڑا سبب کتاب مقدس کا علمی و تحقیقی مطالعہ تھا، چنانچہ سولہویں صدی عیسوی میں تورات کے ترجمے مختلف یورپی ممالک میں

شائع ہوئے، جن کی اصل عبرانی اور عربی تھی، کتاب مقدس کے تراجم میں لبنان کے عیسائی فضلا کی علمی معاونت بھی شامل تھی، لبنان کے مارونی عیسائیوں کے پاپائے روم سے صدیوں سے تعلقات چلے آتے ہیں۔

مشرق بالخصوص اسلامی زبانوں کی ترویج و اشاعت کا دوسرا بڑا محرک یورپی استعمار تھا، انیسویں صدی عیسوی میں فرانس نے الجزائر، مراکش اور تونس پر قبضہ کر لیا، برطانیہ نے ہندوستان پر اپنی حکومت قائم کر لی، ولندیزیوں نے انڈونیشیا پر قبضہ جما لیا، روس نے ترکستان کو غصب کر لیا، اطالیہ نے طرابلس کو ہتھیا لیا اور برطانیہ نے مصر پر اپنی سیادت قائم کر لی، ان مفتوحہ اور زیر حمایت ممالک کے علوم و آداب اور رسوم و رواج سے واقفیت پیدا کرنے کے لیے متعدد ادارے وجود میں آئے، ابتدا میں ان اداروں میں کام کرنے والے زیادہ تر اہل کلیسا تھے، جو دینی عصبیت سے محفوظ نہ تھے، ان کے بعد بہت سے حقیقی عالم بھی پیدا ہوئے جنھوں نے اپنی زندگیاں علوم اسلامیہ کی تحقیق و اشاعت میں صرف کر دیں، انھیں اسلام اور مسلمانوں سے کوئی خاص عناد یا بغض نہ تھا، ان میں سے ہر یورپی ملک کے شیدائیانِ علم اور ان کے علمی کاموں کا سطور ذیل میں تعارف کرایا جاتا ہے:

اطالیہ | جامعۂ روما میں علوم عربیہ کا شعبہ ۱۲۴۳ء سے قائم ہے، اطالیہ کے دوسرے شہروں میں بھی علوم عربیہ کی تدریس و تحقیق کا انتظام ہے، ان میں پاپائے روم کا مدرسۂ لغات شرقیہ خاص طور پر قابل ذکر ہے، جس میں سریانی، عبرانی، آرامی اور عربی زبانوں کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے، یہاں قلمی کتابیں بھی کثیر تعداد میں موجود ہیں، یورپ میں سب سے پہلے اطالیہ کے مختلف شہروں سے عربی کتب کی اشاعت کا آغاز ہوا، چنانچہ ابن سینا کا القانون فی الطب ۱۴۷۳ء میں میلان سے شایع ہوا، ابن رشد کی شروحِ مؤلفاتِ ارسطو بارہ[12] جلدوں میں ۱۵۹۰ء میں شایع ہوئی، اس کے بعد بہت سے تراجم شایع ہوئے۔

انیسویں صدی عیسوی اطالیہ میں عربی زبان کے علوم و فنون کا زریں دور ہے، اس زمانہ میں بہت سے نامور علمائے مشرقیات پیدا ہوئے، جن میں مندرجۂ ذیل خاص طور پر قابل ذکر ہیں:

امیر کایتانی (۱۸۶۹ء تا ۱۹۲۶ء) اطالیہ کا مشہور فاضل اور امیر کبیر تھا، جس نے اپنی دولت عربی مخطوطات کے جمع کرنے میں صرف کر دی، اس کی زندگی کا سرمایہ تاریخ اسلام کی تالیف ہے، جس میں سنہ وار واقعات سنہ ۹۲۲ھ (سنہ ۵۱۷ء) تک مذکور ہیں، اس کی صرف پانچ جلدیں جو سنہ ۱۳۲ھ تک محیط ہیں، چھپ چکی ہیں، اس کا دوسرا سرمایہ عمر شخصیات العالم الاسلامی (علمائے اسلام کے تراجم، ان کے مولفات اور مصادر کا ذکر) ہے، جس کی صرف دو جلدیں ۱۹۱۵ء میں شائع ہو سکیں، بقایا کام ان کی موت کی وجہ سے پورا نہ ہو سکا، ان کا جمع کردہ کتب خانہ مخطوطات عربیہ کا بیش قیمت خزانہ ہے۔

اغناطیوس گیدی (۱۸۴۴ء تا ۱۹۳۵ء) جامعۂ مصریہ میں عربی زبان و ادب، تاریخ و جغرافیہ کا استاذ تھا اور فصیح عربی زبان میں درس دیا کرتا تھا، کتاب الاغانی کی فہارس اس کی علمی یادگار ہے۔

کارلو نللینو (۱۸۷۲ء تا ۱۹۳۸ء) عربی بے تکلف لکھتا اور بولتا تھا، اور جامعۂ مصریہ میں علم الفلک کا درس دیا کرتا تھا، تاریخ علم الفلك عند العرب اس کی مشہور کتاب ہے۔

بوسانی (المولود ۱۹۲۱ء) نے قرآن پاک کا اطالوی زبان میں ترجمہ کیا ہے، اسے اردو اور فارسی سے زیادہ شغف تھا، محمد اقبال، دانتے و اقبال اس کی تصانیف ہیں، الشرق الحدیث (Oriente Moderno) اطالیہ کا مشہور علمی و تحقیقی رسالہ ہے۔

فرانس | اہل فرانس اور عالم عرب کے درمیان تجارتی اور ثقافتی تعلقات صدیوں سے قائم ہیں، صلیبی جنگوں، تجارتی سرگرمیوں، سفیروں کے تبادلے اور شمالی افریقہ اور لبنان میں فرانسیسی

اثر و نفوذ نے ان تعلقات کو مستحکم کرنے میں بڑی مدد کی ہے، فرانسیسیوں نے عربی علوم و فنون، اندلس اور صقلیہ (سسلی) کے مدارس سے حاصل کیے، ۱۲۸۵ء میں علوم مشرقیہ کی تدریس کے لیے ایک درسگاہ قائم کی گئی، چودھویں صدی عیسوی میں جامعۂ پیرس میں شعبۂ عربی کا قیام عمل میں لایا گیا، جو کہ سوربون کے عربی شعبہ کی شاخ تھی، اس کے بعد فرانس کی بیشتر جامعات میں عربی زبان و ادب اور علوم اسلامیہ کی تدریس کا اہتمام ہوا، ۱۶۹۱ء میں عربی ٹائپ کا پریس قائم ہوا، فرانسیسی سیاحوں نے شام اور مصر کا سفر کر کے متعدد سفرنامے لکھے۔

فرانسیسی علمائے مشرقیات میں بیرن دی ساسی (۱۷۵۸ء تا ۱۸۳۸ء) استاذ الاساتذہ کا درجہ رکھتا ہے، اس کا نمایاں علمی کارنامہ مقامات حریری (متن و ترجمہ) کی اشاعت ہے، اس کے بعد کاترمیر (۱۷۸۲ء تا ۱۸۵۲ء) کا نام قابل ذکر ہے، جس نے مقدمۂ ابن خلدون تین۳ جلدوں میں شایع کیا۔

بیرن دی سلان (۱۸۰۱ء تا ۱۸۷۸ء) فرانس اور جرمنی کے متعدد علماء و فضلاء کا استاذ اور شیخ المستشرقین تھا، اس کا بڑا کارنامہ مقدمۂ ابن خلدون اور وفیات الاعیان (ابن خلکان) کا انگریزی ترجمہ ہے۔

ہارٹوک دیرینبورغ (۱۸۴۴ء تا ۱۹۰۸ء) نے مکتبہ اسکوریال (اسپین) کے عربی مخطوطات کی فہرست دو۲ جلدوں میں شایع کی، کتاب (سیبویہ) کا متن اور فرانسیسی ترجمہ مفید حواشی کے ساتھ شایع کرایا، تاریخ الفخری کی عمدہ اشاعت بھی اس کا کارنامہ ہے۔

لیوی پرونفال (۱۸۹۴ء تا ۱۹۵۶ء) نے اپنی ملازمت کا آغاز جامعۂ الجزائر سے کیا، اسے اندلس اور شمالی افریقہ کی تاریخ اور علوم و آداب سے دلچسپی رہی ہے، بے شمار مقالات کے علاوہ اس کا نمایاں علمی کام جمہرۃ انساب العرب (ابن حزم) کی تصحیح اور اشاعت ہے۔

لوئیس ماسینیون (۱۸۸۳ء تا ۱۹۶۲ء) بیسویں صدی کا ممتاز فرانسیسی مستشرق تھا، اس نے ممالک عربیہ کے متعدد سفر کیے اور علمائے اسلام سے ذاتی تعارف پیدا کیا، اس کی دلچسپی کا مرکز اسلامی تصوف رہا ہے، کتاب الطواسین (حلاج) کو پہلے پہل اسی نے شایع کیا۔

لاؤسٹ (المولود ۱۹۰۵ء) کو امام ابن تیمیہ کے افکار اور ان کی تصانیف سے بڑی دلچسپی ہے، چارلس پیلا سوربون میں عربی زبان کا استاذ اور مجلہ ارابیکا (Arabica) کا سکریٹری ہے، اس نے جاحظ کے متعدد رسائل تصحیح و تعلیق کے ساتھ شایع کیے ہیں، قومی کتب خانہ پیرس میں عربی کی ہزاروں کتابیں ہیں، فرانسیسی زبان میں متعدد علمی و تحقیقی رسائل شایع ہوتے ہیں، جن کا موضوع عربی زبان و ادب اور عالم اسلامی کے حالات و مسائل ہوتے ہیں۔

ہالینڈ فرانس کے بعد ہالینڈ عربیات اور اسلامیات کی تدریس کا بڑا مرکز ہے، لائیڈن یونیورسٹی میں عربی زبان کی تعلیم و تدریس کا شعبہ ۱۶۱۳ء سے کام کر رہا ہے، مشہور عالم مطبع بریل کو مستشرق بریل نے ۱۶۸۳ء میں قائم کیا تھا، یہ مطبع پانچ سو سے زائد علوم مشرقیہ کی کتابیں چھاپ کر شایع کر چکا ہے، جن میں نصف عربی زبان میں ہیں، مکتبۃ الجغرافیین العرب کی آٹھ جلدوں میں اشاعت ایک بڑا علمی کارنامہ ہے، الجامع الصحیح البخاری کا ایک عمدہ ایڈیشن ۱۹۰۸ء میں لائیڈن سے شایع ہوا تھا۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام بھی لائیڈن سے چھپ کر شایع ہو رہا ہے، اس کا جدید اشاعت جس میں مسلم ممالک کے اہل علم کے مقالات بھی شامل ہیں، ہر لحاظ سے مستحق تعریف و تحسین ہے، ہالینڈ کے علمائے مشرقیات نے مختلف ادوار میں علوم اسلامیہ کی بڑی خدمت کی ہے، ان میں سے ممتاز علماء کے نام یہ ہیں:

ڈوزی (۱۸۲۰ء تا ۱۸۸۳ء) نے تاریخ اندلس چار جلدوں میں لکھی، تکملۃ معاجم العربیۃ اس کی زندگی کا بڑا کارنامہ ہے۔

ڈی. خویہ (۱۸۳۶ء، ۱۹۰۹ء) نے فتوح البلدان (البلاذری) اور الطبری کی تاریخ الرسل والملوک دوسرے علماء کے اشتراک سے شایع کی، اس عظیم الشان کتاب کا انڈکس اور مختلف فہارس علمی کام کرنے والوں کے لیے ایک بڑی نعمت ہیں۔

ونسنک (Wensinck) (۱۸۸۲ء تا ۱۹۳۹ء): المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی کی سات ضخیم جلدوں میں تدوین اور اشاعت اس کی زندگی کا بڑا کارنامہ ہے، اس کام میں اس کے اور اس کے رفقاء کے تیس (۳۰) برس صرف ہوئے، یہ الفاظ حدیث کا انڈکس ہے جس کی مدد سے ہم بقید ابواب ہر حدیث کو اس کے مقام پر تلاش کر سکتے ہیں۔

جرمنی (البانیا) جرمنی کا عالم اسلام سے علمی رابطہ دوسری صلیبی جنگ (۱۱۴۷ء، ۱۱۴۹ء) سے شروع ہوتا ہے جامعہ ہائیڈلبرگ میں عربی زبان کا شعبہ چودھویں صدی عیسوی کے اواخر سے کام کر رہا ہے، اٹھارہویں صدی عیسوی کے وسط سے شہنشاہ فرڈینان کے عثمانی سلاطین سے سیاسی و تجارتی تعلقات قائم ہوئے، انیسویں صدی کے آغاز میں دی ساسی کے جرمن شاگردوں کے فیض سے علوم اسلامیہ کی اشاعت اور تحقیق میں بڑی ترقی ہوئی، ان میں سے سربرآوردہ علماء کے نام یہ ہیں:

فریٹاگ (۱۷۸۸ء تا ۱۸۶۱ء) نے دیوان الحماسہ بشرح التبریزی مع حواشی و فہارس بون سے شایع کیا، عربی، لاطینی لغت بھی اسی کی علمی کاوش کا نتیجہ ہے۔

فلوگل (۱۸۰۲ء تا ۱۸۷۰ء) نے حاجی خلیفہ کی کشف الظنون (متن و لاطینی ترجمہ) تیرہ (۱۳) برس کی محنت شاقہ کے بعد شایع کی، نجوم الفرقان فی اطراف القرآن اس کا دوسرا کارنامہ ہے، یہ الفاظ قرآن کا انڈکس (اشاریہ) ہے۔

فلائشر (۱۸۰۱ء تا ۱۸۸۸ء) جمعیۃ الشرقیۃ الالمانیہ کا بانی تھا، اس نے تفسیر بیضاوی

المفصل (الزمخشری) اور دوسری کتابیں مفید حواشی کے ساتھ شایع کیں۔

وسٹنفلٹ (۱۸۰۸ء تا ۱۸۹۹ء) نے ساٹھ (۶۰) برس عربی زبان، اس کے علوم و آداب کی خدمت کی، وفیات الاعیان (ابن خلکان) تہذیب الاسماء (نووی) طبقات الحفاظ (الذہبی)، کتاب المعارف (ابن قتیبہ) تاریخ مکہ، سیرت ابن ہشام اور معجم البلدان (یاقوت) وغیرہ کی تصحیح اور اشاعت اس کی زندگی کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔

آلورٹ (۱۸۲۸ء، ۱۹۰۹ء) فہرست مکتبہ برلن اس کی فضیلت پر شاہد ہے۔

یان (Jahn) (۱۸۳۶ء تا ۱۹۱۷ء) نے شرح المفصل (ابن یعیش) مفید تعلیقات کے ساتھ شایع کرنے کے علاوہ کتاب (سیبویہ) کا جرمن میں ترجمہ شایع کیا، جو حیرت انگیز کارنامہ ہے۔

زخاؤ (۱۸۴۵ء تا ۱۹۳۰ء) فلائشر کا شاگرد رشید تھا، البیرونی کی تحقیق ما للہند (متن و انگریزی ترجمہ) اور الآثار الباقیۃ (متن و انگریزی ترجمہ) اس کی یادگار ہے۔

کارل بروکلمان (K. Brockelmann) (۱۸۶۸ء تا ۱۹۵۶ء) امام المستشرقین ہے، اس کا غیر فانی کارنامہ تاریخ الادب العربی کی تالیف ہے (پانچ جلدیں، مطبوعہ لائیڈن) اس کی وسعت معلومات پر ایک طالب علم حیرت زدہ ہو کر رہ جاتا ہے، عالم عرب کی مطبوعات کے علاوہ امرتسر، دہلی اور بھوپال تک کی چھپی ہوئی کتابیں اس کی دسترس میں ہیں، ہمارے جہان کے کتب خانوں کی قلمی کتابوں کی فہارس اس کے پیش نظر ہیں، سوانح اور تراجم کی کتابیں اس کی نوک زبان ہیں، لیکن افسوس کے ساتھ یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ اس کی تاریخ اسلام (جس کا عربی میں ترجمہ تاریخ الشعوب الاسلامیۃ کے نام سے ہو چکا ہے) اس کے دامن فضیلت پر بدنما دھبہ ہے، اس میں جابجا یورپ کے روایتی مسیحی تعصب کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔

فیشر (۱۸۶۵ء تا ۱۹۴۹ء) نے معجم اللغۃ العربیۃ کی جمع و ترتیب میں چالیس برس گذار دیے، اس عظیم الشان لغت کا مدار قدیم عربی کتب لغت پر ہے، المجمع اللغوی (قاہرہ) کے اہتمام میں اس کے چند اجزاء شایع ہوئے ہیں،

ہیلٹ، ریٹر (H. Ritter، ۱۸۹۲ء تا ۱۹۷۱ء) نے اپنی عمر گراں مایہ کے تیس سال استنبول کے کتب خانوں میں نادر کتابوں کی تلاش و تحقیق میں بسر کر دیے، عربی کتابوں کی اشاعت کے لیے مکتبۂ اسلامیۂ استنبول میں قائم کیا، جس کے اہتمام میں مقالات الاسلامیین (اشعری) اور اسرار البلاغۃ (عبد القاہر الجرجانی) (متن و جرمن ترجمہ) وغیرہ نہایت آب و تاب سے شایع ہو چکی ہیں، الصفدی کی الوافی بالوفیات، عربی میں سوانح و تراجم کا بڑا خزانہ ہے، اس کی چھ سات جلدیں ریٹر اور اس کے رفقاء کے طفیل اب تک اشاعت پذیر ہو چکی ہیں۔

فؤاد سیزگین: ایک ترک عالم اور ریٹر کا شاگرد رشید ہے، اس نے الجامع الصحیح للبخاری کے مصادر و مآخذ پر ترکی زبان میں ایک کتاب لکھی ہے، مجاز القرآن (ابو عبیدہ معمر بن مثنیٰ) کو نہایت محنت سے شایع کیا ہے، کارل بروکلمان کی تاریخ الادب العربی کو نظر ثانی اور مفید اضافوں کے ساتھ جرمن زبان میں شایع کیا ہے، اب تک اس جلیل القدر کتاب کی پانچ جلدیں شایع ہو چکی ہیں جو فاضل مصنف کی فضیلت پر شاہد ہیں، اسے فیصل انعام بھی ملا ہے۔

روڈی پیرٹ نے قرآن مجید کا جرمن زبان میں ترجمہ تین جلدوں میں شایع کیا ہے، کہا جاتا ہے کہ یہ ترجمہ سب جرمن ترجموں میں بہتر اور مستند ہے۔

استنبول کے علمی خزائن سے ہماری واقفیت، اور شناسائی تمام تر جرمن مستشرقین کی علمی مساعی کی مرہونِ منت ہے۔

جرمنی کی ہر یونیورسٹی میں عربی اور اسلامی کتب کا بیش بہا ذخیرہ موجود ہے، علوم اسلامیہ پر مباحث اور مقالات کے لیے مجلۃ الاسلام (جرمن) ہیمبرگ، اور مجلہ عالم الاسلام (لائپزگ) قابل ذکر ہیں، لائپزگ اور ویز باون کے عربی پریس صحتِ طباعت کے لیے سارے یورپ میں مشہور ہیں۔

آسٹریا ہنگری | آسٹریا کے مستشرقین کی توجہ زیادہ تر ترکی ادبیات تک محدود رہی ہے، ان میں سر بر آوردہ عالمِ مشرقیات گولڈ تسیہر (۱۸۵۰ء تا ۱۹۲۱ء) تھا، جس نے قاہرہ جا کر مفتی محمد عبدہٗ سے بھی استفادہ کیا تھا، اس کی تصانیف میں حدیث کے مطالعات کی یورپی حلقوں میں بڑی دھوم رہی ہے، اس کتاب کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔

عبد الکریم جرمانوس (۱۸۸۴ء تا ۱۹۷۹ء) نے اپنی زندگی کا آغاز شانتی نکیتن میں استاذ عربی سے کیا (۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۲ء) بعد ازاں انھوں نے جامعہ ملیہ جا کر اسلام قبول کر لیا اور قاہرہ پہونچ کر شیوخ ازہر سے علم کی تکمیل کی، وطن واپس آکر بوڈاپسٹ یونیورسٹی میں ایک عرصہ تک صدر شعبۂ مشرقیات رہے، ترکی زبان و ادب کے متعلق ان کی تحقیقات اہم نتائج کی حامل ہیں، وہ حج سے بھی سرفراز ہوئے تھے۔

روس | روس کی جامعات میں عربی، فارسی اور ترکی زبانوں کی تعلیم و تدریس کا انتظام بڑے عرصہ سے قائم ہے، روسی علماء نے الفارابی، ابن سینا اور البیرونی کی کتابوں کے روسی زبان میں تراجم شایع کیے ہیں، جدید عربی زبان کے ناولوں، ڈراموں اور افسانوں کی بیشتر تعداد روسی زبان میں منتقل ہو چکی ہے۔

علمی تحقیقات کے سلسلہ میں کراتشوفکی (۱۸۸۳ء تا ۱۹۵۱ء) کا نام خاص طور پر

قابل ذکر ہے، اس نے شام اور لبنان میں ایک عرصہ تک قیام کرکے وہاں کے ادباء سے ذاتی مراسم پیدا کیے تھے، اس کی تصانیف میں قرآن مجید کا روسی ترجمہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔

کتاب البدیع (ابن المعتز) اس کی تصحیح و تحشیہ سے پہلی دفعہ شایع ہوئی، عرب جغرافیہ نویسوں کے حالات اور کارناموں کے متعلق اس کی کتاب عربی میں ترجمہ تاریخ الادب الجغرافی کے نام سے چھپ چکی ہے۔

کسی زمانہ میں قازان کے عربی مطابع ترکستان بھر میں مشہور تھے، لیکن اب عربی کی دینی کتب کی طباعت اور اشاعت حکماً ممنوع ہے، ادھر چند سالوں سے صرف قرآن پاک کی طباعت سرکاری انتظام میں ہونے لگی ہے۔

انگلستان: آکسفورڈ اور کیمبرج کی جامعات میں عربی زبان و ادب کے شعبے اٹھارہویں صدی عیسوی سے قائم ہیں، لندن میں سکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز ۱۹۱۶ء سے کام کر رہا ہے، اور نامور مستشرقین مثلاً سر طامس آرنلڈ اور مسٹر گب اس درسگاہ سے وابستہ رہے ہیں، انگلستان کے معروف مستشرقین اور ان کی علمی خدمات کا تذکرہ سطور ذیل میں درج ہے۔

جارج سیل (۱۶۹۷ء، ۱۷۳۶ء) نے انگریزی زبان میں قرآن پاک کا ترجمہ کیا، جو غالباً فرانسیسی ترجمہ سے ماخوذ ہے، اس کے مقدمہ میں مترجم نے عجیب و غریب خیالات کا اظہار کیا ہے۔

ایڈورڈ لین (۱۸۰۱ء، ۱۸۷۶ء): مدالقاموس (عربی، انگریزی لغت) اس کی تیس سالہ کاوش کا نتیجہ ہے، یہ لغت نہایت معتبر اور مستند مانی جاتی ہے، الف لیلہ کا انگریزی ترجمہ (چھ جلدیں) اس کی علمی یادگار ہے۔

ایڈورڈ ہنری پامر (۱۸۴۰ء، ۱۸۸۲ء) عربی نظم و نثر پر یکساں قدرت رکھتا تھا، ترجمہ قرآن کریم اور دیوان البہاء زہیر (متن و انگریزی ترجمہ) اس کا بڑا کارنامہ ہے۔

ولیم رائٹ (۱۸۳۰ء تا ۱۸۸۹ء) نے ڈوزی سے علوم عربیہ کی تکمیل کی تھی، اس کا علمی کارنامہ الکامل (المبرد) کی تین جلدوں میں اشاعت ہے، عربی قواعد پر اس کی انگریزی کتاب نہایت مفید اور جامع ہے۔

سر ولیم میور (۱۸۱۹ء تا ۱۹۰۵ء) سابق گورنر یو۔پی (اترپردیش) لائف آف محمد اور تاریخ الخلفاء کا مصنف، یہ دونوں کتابیں متنازعہ فیہ چلی آ رہی ہیں، سر سید نے لائف آف محمد کے جواب میں اپنی مشہور کتاب خطبات احمدیہ لکھی تھی۔

سر چارلس لائل، انڈین سول سروس کا ممبر اور سی۔پی (مدھیہ پردیش) میں کمشنر تھا، اشعار جاہلیت اس کا خاص موضوع تھا، المفضلیات (الضبی)، بشرح الانباری (متن و انگریزی ترجمہ) کی اشاعت اس کی یادگار ہے۔

ایڈورڈ جارج براؤن (۱۸۶۲ء، ۱۹۲۶ء) کیمبرج میں عربی و فارسی کے ممتاز استاذ تھے، تاریخ ادبیات ایران (چار جلدیں) ان کا عظیم الشان کارنامہ ہے، چہار مقالہ (متن و انگریزی ترجمہ) اور لب الالباب کی اشاعت بھی ان کی علمی کاوش کی مرہون منت ہے۔

سر طامس آرنلڈ (۱۸۶۴ء، ۱۹۳۰ء) علی گڑھ کالج اور گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے پروفیسر تھے، ۱۹۰۵ء میں لندن یونیورسٹی کے استاذ عربی بن کر واپس چلے گئے، شبلیؒ اور اقبال کے علمی ذوق کو پختہ کرنے میں ان کا بڑا دخل ہے، ان کی مشہور کتاب پریچنگ آف اسلام (دعوت اسلام) کا اردو، عربی اور ترکی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے، اخیر زمانے میں ان کی توجہ کا مرکز اسلامی مصوری بن گئی تھی۔

بے حد دلچسپی تھی، عربی زبان کے جدید ادب پر ان کی نظر بڑی گہری اور ناقدانہ تھی۔

امریکہ | امریکہ میں استشراق کی تاریخ کی ابتداء انیسویں صدی کے اوائل سے ہوتی ہے، لبنان کے عیسائی فضلاء امریکہ کی یونیورسٹیوں میں علوم عربیہ کا درس دیتے رہے ہیں، ان میں قابل ذکر فلپ خوری حِتّی ہے جس کی ہسٹری آف عربز (عربوں کی تاریخ) مقبول عام کتاب ہے، اس نے لبنان اور شام کی تاریخ بھی انگریزی میں لکھی ہے۔

جارج سارٹن (۱۸۸۴ء تا ۱۹۵۶ء) بلجیم کا رہنے والا تھا، لیکن پہلی جنگ عظیم کے بعد امریکہ چلا آیا تھا اور امریکی شہریت اختیار کرلی تھی، اسے عربوں کے علوم وفنون کی تاریخ سے بڑی دلچسپی تھی، اس شوق میں اس نے بیروت میں ایک عرصہ قیام کرکے عربی زبان سیکھی، اس کا عقیدہ تھا کہ صرف عربی زبان کے ذریعہ قدیم یونانی علوم وفنون تک رسائی ہوسکتی ہے، اور یونانی اور لاطینی زبانوں کے درمیان عربی ہی واسطۃ العقد ہے، اس نے کئی سالوں کی محنت شاقہ کے بعد انگریزی میں ہسٹری آف سائنس (Introduction to History of Science) (تاریخ العلوم) کے نام سے ایک کتاب پانچ ضخیم جلدوں میں لکھی ہے، جس میں مسلم علماء اور حکماء کے سائنسی کارناموں کا بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے، اس عظیم الشان کتاب کے بعض حصے عربی میں منتقل ہوکر قاہرہ سے شائع ہوچکے ہیں۔

فرانز روزنتال ایک جرمن مستشرق ہے، جو کسی امریکی یونیورسٹی سے متعلق ہے، اس نے مقدمہ ابن خلدون کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے، مسلمانوں کی تاریخ نویسی کی تاریخ کے علاوہ اسلام میں علم کے تصور پر ایک بلند پایہ کتاب لکھی ہے، جو بے حد مقبول ہوئی ہے۔

خاتمہ | ہمیں تسلیم ہے کہ بعض مستشرقین کی کتابوں میں یورپ کے روایتی مسیحی تعصب کی جھلک بھی نظر آتی ہے، ہمیں یہ بھی اقرار ہے کہ ان سے دانستہ اور نادانستہ غلطیاں بھی ہوتی ہیں لیکن

مارگولیتھ (Margoliouth) (مرجلیوث) (۱۸۵۸ء، ۱۹۴۰ء) آکسفورڈ یونیورسٹی کا نامور عربی فاضل جو بے تکان عربی بولتا اور لکھتا تھا، تفسیر بیضاوی (سورۂ آل عمران) اور رسائل ابی العلاء المعری کا انگریزی ترجمہ اس کا مشہور علمی کارنامہ ہے، معجم الادباء (یاقوت حموی) اور کتاب الانساب (السمعانی) کی اشاعت اس کی علمی کاوش کا نتیجہ ہے، اس کی لائف آف محمد علمی حلقوں میں تنقید اور تردید کا موضوع بنا رہا ہے، اس کی غلط بیانیوں کو دیکھتے ہوئے مولانا شبلی مرحوم کو سیرۃ النبیؐ کی تالیف کا خیال پیدا ہوا تھا۔

رینالڈ نکلسن (۱۸۶۸ء، ۱۹۴۵ء) کیمبرج یونیورسٹی میں عربی وفارسی کے استاد تھے، انھیں تصوف اسلام سے بڑی دلچسپی تھی، منتخبات دیوان شمس تبریز، کشف المحجوب (داتا گنج بخش ہجویریؒ) اسرار خودی (اقبال)، اور مثنوی مولانائے روم کے انگریزی تراجم ان کے قابل ستائش کارنامے ہیں۔

کرنکو (Krenkow) (۱۸۷۲ء تا ۱۹۵۳ء) نسلاً جرمن تھے، لیکن انگریزی قومیت اختیار کرلی تھی، اسلام قبول کرنے کے بعد انھوں نے اپنا نام محمد سالم کرنکوی رکھ لیا، جمھرۃ فی اللغۃ (ابن درید) اور تنقیح المناظر (قطب الدین الشیرازی)، اور الدرر الکامنۃ (ابن حجر) اور بہت سے عربی دواوین کی اشاعت ان کی زندگی کا بہترین کارنامہ ہے۔

آربری (Arberry) (۱۹۰۵ء، ۱۹۶۹ء) جامعہ مصریہ قاہرہ میں قدیم زبانوں کے استاد تھے، پھر انڈیا آفس لندن میں لائبریرین بن گئے، بعد ازاں کیمبرج یونیورسٹی میں شعبۂ عربی اور فارسی کے استاد مقرر ہوئے، تصوف اسلام سے انھیں بڑا شغف تھا، کتاب التعرف (الکلاباذی) کتاب المواقف (النفری) کی تصحیح واشاعت اور قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ ان کی یادگار ہے، نثر فارسی کی تاریخ انگریزی میں لکھی ہے اور حکایات رومی کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔

برطانوی مستشرقین میں ہملٹن گب کا نام بھی ذکر کے قابل ہے، عالم اسلامی کی تحریکات سے انھیں

ساتھ ہی علمی دیانت کا تقاضا ہے کہ ان کی تلاش و محنت اور شوق علم یا جنون علم کا کھلے دل سے اعتراف کیا جائے، یورپ کے مشرقی علوم کے فاضلوں کی محنت کی بدولت اسلامی تاریخ، جغرافیہ، ادب، شعر، لغت، تفسیر اور فلسفہ اور دوسرے بہت سے علوم کے متعلق سیکڑوں کتابیں تصحیح و تعلیق سے نہایت عمدگی کے ساتھ چھپ کر شائع ہو چکی ہیں، جن کے نام صرف کتابوں میں مذکور تھے۔

جس محنت سے ڈوزی نے اپنا تکملہ لغات عربی میں ترتیب دیا، زخاؤ نے کتاب الہند کی تصحیح کی، ڈی خویہ نے تاریخ الطبری کو، فلوگل نے کشف الظنون کو، رائٹ نے المبرد کی الکامل کو، وسٹنفیلٹ نے سیرت ابن ہشام کو، ڈیٹر نے مقالات الاسلامیین اور عبدالقاہر الجرجانی کی اسرار البلاغہ کو اور دوسرے مستشرقین نے سیکڑوں کتابوں کو برسہا برس کی جس محنت، جانفشانی اور تصحیح اور تحشیہ اور مختلف فہارس کے ساتھ چھاپ کر شائع کیا اس کیلئے ہم ان کے شکر گذار ہیں۔

ونسنک اور اس کے رفقاء نے تیس ۳۰ برس کی محنت شاقہ کے بعد کتب حدیث کا انڈکس بنام المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی سات ضخیم جلدوں میں مرتب کر کے شائع کیا ہے، جو عصر حاضر کا عظیم کارنامہ ہے، مسلم ممالک کی تاریخی عمارتوں اور ان کے فنون لطیفہ پر (K. A. C. Creswell) کریسول کی شہرۂ آفاق تصانیف بھی قابل توجہ ہیں۔

ہمارے ہاں صرف شعر و شاعری کو ادب سمجھا جاتا تھا، مستشرقین نے نثر کو بھی برابر کا درجہ دیا، ہمارے ہاں نقد الادب پر گنتی کی چند کتابیں تھیں، مستشرقین نے ادبی تنقید کو بھی ادب کی مستقل اور اہم شاخ بنا دیا ہے، قلمی کتابوں کی فہرست نگاری اور مسکوکات کی شناخت کے لیے ہم تمام تر مستشرقین کے مرہون منت ہیں، اسلامی ادبیات کی تاریخ کے لیے براؤن کی تاریخ ادبیات ایران، بروکلمان کی تاریخ الادب العربی اور اسٹوری کی پرشین لٹریچر آج بھی مستند اور معتبر ماخذ کا درجہ رکھتی ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے نوجوان علماء مستشرقین سے شوق علم، لگن اور محنت کا سبق لیں اور ان کی غلطیوں، کوتاہیوں اور فرو گذاشتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے علوم اسلامیہ کی خدمت ان سے بہتر اور احسن طریقہ پر سر انجام دیں۔

＊＊＊

قسطا بن لوقا البعلبکی

دور عباسی میں طب کی ایک ممتاز شخصیت

از جناب نسیم احمد اعظمی، لٹریری ریسرچ یونٹ خدا بخش خاں لائبریری، پٹنہ

طب کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ابتداء کرنے کا دعویٰ بہت سے ملکوں نے کیا ہے، اس میں مصر، بابل اور ہندوستان قابل ذکر ہیں، لیکن ایک بات جو سب کے دعاوی میں مشترک طور پر ملتی ہے وہ یہ ہے کہ ابتدائی دور میں طب مذہب کے زیر اثر تھی، مذہبی رہنما اس کے وارث اور علمبردار قرار دیے گئے تھے، اور ہر طبی مسئلہ کا حل مخصوص مذہبی عقیدے کی روشنی میں تلاش کیا جاتا تھا، یونان کے عہد زریں میں طب کو مذہب کی گرفت سے آزادی ملی، اور ایک علم کے طور پر اس نے ترقی کی منزلیں طے کرنی شروع کیں[1]، یونانیوں کے زوال کے بعد یہ علم روم ہوتا ہوا عربوں تک پہونچا، مزید عربوں نے مختلف مقامات سے کتابیں حاصل کرنا شروع کیں، اس دور میں یہ علمی مذاق اس قدر بڑھ گیا تھا کہ جہلاء بھی کتابوں کا قابل قدر ذخیرہ رکھتے اور اس پر نازاں رہتے تھے۔

مسلمانوں کو عیسائیوں پر جب غلبہ حاصل ہوا تو خالد بن یزید بن معاویہؓ (متوفی ۸۵ھ؍ ۷۰۴ء) نے ماریانوس[2] اور اصطافن القدیم کے ذریعہ فن کیمیاء سے متعلق یونانی کتابوں کو عربی زبان میں

---

[1] دیباچہ تجدید طب ص ۱، مرتبہ حکیم سید ظل الرحمٰن　[2] المنجد ص ۲، ۱ فی الادب و العلوم : الاب لویس معلوف الیسوعی۔

ترجمہ کرایا[۱]۔ اسلامی تاریخ میں یونانی زبان سے عربی زبان میں یہ پہلا ترجمہ تھا[۲]۔ بعد میں عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور (متوفی ۷۷۵ء) نے رومی شہنشاہ کے پاس قاصد بھیج کر کتابیں منگوائیں، عیسائی مترجمین نے ان کا عربی زبان میں ترجمہ کیا، مسلمانوں نے پڑھا، مزید اشتیاق پیدا ہوا، نتیجہ کے طور پر مامون الرشید (۷۸۶ء، ۸۳۳ء) نے رومی شہنشاہ سے علوم فلسفہ کی جملہ کتابیں طلب کیں، وہاں سے مثبت جواب ملنے پر مامون الرشید نے حجاج بن مطر، ابن البطریق اور سلما کو کتابیں لانے کا کام سپرد کیا، کتابیں آجانے پر ان کا عربی میں ترجمہ کرایا، یونانی اور سُریانی زبانوں کے علاوہ نبطی، فارسی اور سنسکرت سے تراجم بھی تقریباً اسی دور میں ہوئے، اس دور میں ترجمے کے دو انداز تھے، لفظی ترجمہ اور محاوراتی ترجمہ، پہلا انداز ابن البطریق اور ابن نعیمہ حمصی کا تھا، دوسرا حنین بن اسحاق اور جوہری کا، ترجمہ کے سلسلے میں چار خاندان آل بختیشوع، آل ماسرجویہ، آل ثابت، اور آلِ حنین نے بڑی دلچسپی لی[۳]۔ مترجمین کی فہرست میں مذکورہ خاندان کے علاوہ حسب ذیل نام نمایاں طور پر لیے جاسکتے ہیں:

یوحنا بن ماسویہ، تیاذوق، عیسیٰ بن حکم، جابر بن حیان، زکریا رازی، عثمان الدمشقی، ابن نعیمہ، عیسیٰ بن یحییٰ، موسیٰ بن خالد، یوحنا بن بطریق، اصطفان بن باسل، یحییٰ بن ثابت، ابراہیم بن صلت، ابراہیم بن بختیشوع، ثابت بن قرۃ الکندی اور قسطا بن لوقا۔

قسطا بن لوقا علم حساب، ہندسہ، نجوم، منطق اور طبیعیات کا محقق اور فن طب کا ماہر تھا[۴]، بعض رائے کے مطابق اس کو فن موسیقی سے بھی شغف تھا[۵]، اس کا وطن شام کا مشہور علمی شہر البعلبک تھا

---

[۱] الفہرست ص ۲۴۴ ابن ندیم [۲] الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند ص ۲۶۲ از حکیم عبدالحیٔ (اردو ترجمہ) [۳] تاریخ طب و اطبائے قدیم ص ۲۴ حصۂ اول، سید حید، علی جعفری [۴] طبقات الامم ص ۴۴ (اردو ترجمہ) قاضی ابوالقاسم صاعد ابن احمد الاندلسی [۵] المنجد ص ۱۶۴ فی الادب والعلوم۔

جس کو اہل یونان عقیدت و احترام کی وجہ سے "مدینۃ الشمس" کہتے تھے، وہ یونانی النسل تھا اور عقیدے کے اعتبار سے ایک کلیسا کا پیرو، مذہبیات میں بھی دخل ہونے کی وجہ سے انھوں نے ایک نسطوری پادری سے حضرت مسیحؑ کی ثنویت پر بحث کی تھی[۱]۔

قسطا بن لوقا کے سنہ ولادت اور وفات کی تعیین اگرچہ بعض تذکرہ نگاروں نے کی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمیں یقینی طور پر اس کا سنہ ولادت اور سنہ وفات معلوم نہیں ہے، ان سنین کی تعیین کے لیے ہم واقعات کی کڑیاں جوڑنے پر مجبور ہوتے ہیں، تذکروں میں ہے کہ خلیفہ مستعین باللہ (۸۶۲ء، ۸۶۶ء) کے لیے Heron کی تصنیف "کتاب الاوزان والمکائیل" کا ترجمہ کیا تھا، ابوالحسن علی بن یحییٰ (۸۸۸ء، ۸۸۹ء) کے لیے کتاب المدخل الکلی [illegible] (۸۷۰ء، ۸۹۳ء) کے وزیر اسمٰعیل بن بلبل کے نام "کتاب فی شکل الکرۃ الاسطوانۃ" [illegible] کی، وہ المقتدر باللہ (۹۰۸ء، ۹۳۲ء) کے عہد میں زندہ تھا، کیونکہ المقتدر باللہ کے مصاحب ابو اسحاق ابراہیم بن المدبر سے اس کے دوستانہ مراسم تھے[۳]۔

سارٹن (Sarton) کا خیال ہے کہ قسطا بن لوقا کا انتقال ۹۱۲ء میں ہوا[۴]، صاحب المنجد کا بھی یہی خیال ہے[۵]، بعض ذرائع معلومات یہ بھی بتاتے ہیں کہ قسطا بن لوقا چونکہ المقتدر باللہ کے عہد (۹۰۸ء، ۹۳۲ء) میں تھا، لہٰذا وہ ۹۳۲ء تک باحیات رہا ہوگا[۶]۔ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں قسطا کا ایک طبی مخطوطہ "کتاب فی الوباء واسبابہ" کے نام سے ملتا ہے، اس کے مطابق قسطا بن لوقا

---

[۱] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ ص ۳۶ ج ۱۶/۲ شایع کردہ دانش گاہ پنجاب لاہور [۲] ایضاً ص ۱۳۶ ج ۱۶/۲ [۳] ایضاً ص ۱۳۷ ج ۱۶/۲ [۴] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ ص ۱۳۷ ج ۱۶/۲ شایع کردہ دانش گاہ پنجاب لاہور [۵] المنجد ص ۱۶۴ فی الادب والعلوم [۶] نوادر ص ۹۱ خدا بخش لائبریری مرتبہ اطہر شیر طب العرب ص ۴۰ پر سال وفات ۹۲۳ء تحریر ہے۔

نے اسے خوارزم کے بادشاہ ابوالعباس مامون بن مامون کے حکم پر لکھا تھا[1]۔ ابوالعباس کو ۱۰۱۶ء میں قتل کیا گیا تو گویا قسطا بن لوقا کوئی ۱۰۱۶ء تک حیات رہا ہوگا، بعض تذکروں میں ہے کہ اس کی پیدائش ۸۲۰ء کے قریب ہوئی اور اس نے ستر یا اسّی برس کی عمر پائی[2]۔

پہلے ذکر کیا گیا کہ قسطا بن لوقا کو فلسفہ، ہندسہ، ہیئت، حساب، موسیقی اور طب وغیرہ میں کامل دسترس تھی، وہ لسانیات کا بھی ماہر تھا، یونانی، سریانی اور عربی پر اچھی نگاہ رکھتا تھا[3]۔

ابن ندیم کے خیال میں وہ مشہور طبیب و مترجم حنین ابن اسحاق العبادی (۸۱۰ء۔۸۷۳ء) سے بلند مرتبہ تھا[4]، لیکن ابن ندیم کے بعض ہمعصروں کا خیال ہے کہ وہ حنین کے مقابلہ میں دوسرے درجہ پر تھا[5]۔ ابن ندیم نے خود کتاب الفہرست میں حنین کا ذکر پہلے اور قسطا بن لوقا کا بعد میں کیا ہے[6]، اس طرح گویا انھوں نے بھی عملی طور پر حنین بن اسحاق العبادی کی برتری کو تسلیم کیا ہے۔

جدید مصنفین بھی حنین بن اسحاق العبادی کی برتری کے معترف نظر آتے ہیں[7]۔ بہرحال قسطا بن لوقا کی فنی اور لسانی صلاحیتوں کا سب کو اعتراف ہے، اس کے تراجم کے انداز، اسلوب نگارش اور طریقۂ ترتیب نے بڑی شہرت پائی ہے[8]۔

عباسی دور حکومت میں قسطا بن لوقا شام سے روم چلا گیا اور وہاں کے دانشوروں سے کتابیں اور نادر مخطوطے حاصل کرکے پھر شام لوٹ آیا، اس کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے عباسی خلفا میں سے

---

[1] خدا بخش لائبریری کیٹلاگ ص ۱۹ ج ۴ [2] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ ص ۱۳۷ ج ۱۹ / ۲۔

[3] الفہرست ص ۲۴۴، ابن ندیم [4] ایضاً ص ۲۴۴ [5] ایضاً ص ۲۹۵ [6] ابن ندیم نے حنین ابن اسحاق العبادی کا ذکر ص ۲۹۴ پر کیا ہے اور قسطا بن لوقا کا ص ۲۹۵ پر کیا ہے۔

[7] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ ص ۱۳۷ ج ۱۶ / ۲ [8] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ ص ۱۳۷ ج ۱۶ / ۲۔

کسی[1] نے یونانی زبان سے عربی میں ترجمہ کرنے کے لیے عراق بلا لیا[2]۔ وہاں انھوں نے تراجم کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ ان ترجموں کی لسانی تصحیح بھی کی جو حنین بن اسحاق یا بعض دوسرے مترجمین نے کیے تھے[3]۔ اس کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ اس نے قدیم یونانی علوم کو مشرق تک پہونچایا، اور ان سے لوگوں کو متعارف کرایا[4]۔

ابن ابی اصیبعہ عبداللہ ابن جبرئیل کے حوالہ سے لکھتا ہے: زندگی کے آخری ایام میں آرمینیا کے بادشاہ سنحاریب نے اسے اپنے ہاں بلا لیا اور وہ وفات تک وہیں رہا[5]۔ وہیں اس کی تکفین و تدفین بھی ہوئی، اس کے اعزاز میں اس کے مقبرے پر ایک قبہ تعمیر کرایا گیا، حالانکہ یہ امتیاز اس دور میں صرف امراء اور بلند مرتبہ مذہبی عہدیداروں کے لیے مخصوص تھا[6]۔

قسطا بن لوقا بہت ملنسار طبیعت کا تھا، معاصرین کے ساتھ اس کے روابط بہت خوشگوار تھے، مشہور فلسفی یعقوب بن اسحٰق الکندی (متوفی ۸۷۳ء) اس کا معاصر تھا، تذکروں میں ہے کہ اس نے متعدد لوگوں کی طرف اپنی تصانیف کا انتساب کیا، جن میں مذہبی اور سیاسی دونوں شخصیتیں شامل ہیں، انھوں نے مشہور ہیئت داں ابو عیسیٰ ابن المنجم کے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے اثبات کے بارے میں ایک خط لکھا تھا[8]۔

---

[1] ڈاکٹر غلام جیلانی برق کی تحقیق کے مطابق مامون نے طلب کیا ہوگا، ملاحظہ فرمائیں حاشیہ تاریخ الحکماء، اردو ترجمہ ص ۳۵۶ [2] تاریخ الحکماء ص ۳۶۱ (فارسی ترجمہ) ابن القفطی۔

[3] طبقات الاطباء ص ۲۴۴ جزء اول، ابن ابی اصیبعہ، الفہرست ص ۲۴۴ [4] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ ص ۱۳۷ ج ۱۶ / ۲ [5] طبقات الاطباء ص ۲۴۴ جزء اول، تاریخ الحکماء ص ۳۶۲، الاعلام ص ۴۰ خیرالدین زرکلی [6] ایضاً ص ۲۴۴، طبقات [7] تاریخ الحکماء ص ۳۶۱۔ مختصر الدول ص ۲۵۹ ابی الفرج [8] عیون الانباء فی طبقات الاطباء ص ۲۴۴ الجزء الثانی۔

قسطا بن لوقا کی حیات اور خدمات کے بارے میں ہماری معلومات کا اصل ماخذ ابن ندیم کی الفہرست اور ابن ابی اصیبعہ کی "عیون الانباء فی طبقات الاطباء" ہے، دوسرے تذکروں میں اس کے بارے میں جس قدر لکھا گیا ہے ان کا ذریعہ معلومات بھی یہی کتابیں ہیں، اس کی تصانیف کی تعداد کا تعین بہت مشکل ہے، ابن ابی اصیبعہ نے اس کی باسٹھ[٦٢] کتابوں کے نام بتائے ہیں[1] ابن القفطی نے تقریباً بائیس[٢٢] کتابوں کی نشاندہی کی ہے[2] قاضی ابوالقاسم صاعد بن احمد الاندلسی نے چھ کتابوں کا ذکر کیا ہے[3] ابن ندیم نے چونتیس[٣٤] کتابوں کا نام لکھا ہے[4] خیرالدین الزرکلی نے تقریباً سولہ[١٦] کتابوں کا تذکرہ کیا ہے[5] لویس معلوف الیسوعی نے متعدد تصانیف کے وجود کا اعتراف کرتے ہوئے صرف دو[٢] تصانیف کا ذکر کیا ہے[6] حکیم عبدالحئی کے خیال میں قسطا بن لوقا نے ترجمہ، شرح اور تفسیر کے علاوہ چونتیس[٣٤] مستقل کتابیں لکھی تھیں[7]

قسطا بن لوقا کی یہ تصانیف علم سحر، ریاضی، ہندسہ، نجوم، فلسفہ، تاریخ، فلکیات، طبیعیات، رنگ ریزی، زراعت اور طب وغیرہ علوم و فنون پر مشتمل ہیں، تصانیف اور فنون کا مختصر جائزہ درج ذیل ہے:

سحر: اس موضوع پر اس کی تصنیف کا لاطینی ترجمہ ہی دریافت ہو سکا ہے، اس میں اس نے تعویذوں اور جادو ٹونے پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ موثر ہیں، ان کے سبب روح کو تقویت ملتی ہے اور حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔

ریاضی: اس موضوع سے متعلق یونانی کتابوں کے مشکل اور غیر معروف مباحث پر قلم

---

1 عیون الانباء فی طبقات الاطباء، ص ۲۴۴-۲۴۵ جزء اول 2 تاریخ الحکماء ص ۳۶۱ (فارسی ترجمہ)
3 طبقات الامم ص ۴۳ (اردو ترجمہ) 4 الفہرست ص ۲۹۵ 5 الاعلام ص ۴۰ جزء سادس 6 المنجد ص ۴۱۶ فی الادب والعلوم 7 الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند، ص ۴۰۵ (اردو ترجمہ)

اٹھایا ہے، اس کی ایک کتاب چند سال قبل شائع بھی ہو چکی ہے، خدا بخش لائبریری پٹنہ میں اس کا ایک نسخہ نظر سے گذرا ہے۔

ہندسہ: اس موضوع سے متعلق ایک کتاب "المدخل الی علم الہندسۃ علی المسائل والجواب" کا پتہ چلتا ہے۔

نجوم: اس موضوع پر اس کی گرانقدر تصنیف "المدخل الی علم النجوم" ہے۔

فلسفہ: اس موضوع پر اس کی ایک مشہور کتاب "الفرق بین الروح والنفس" کا نام لیا جا سکتا ہے، اس میں اس نے روح اور نفس کے فروق کو بڑی خوبصورتی سے واضح کیا ہے، اور جہاں کہیں بھی عضویاتی افعال زیر بحث آئے ہیں وہاں اپنی بے پناہ طبی بصیرت کا ثبوت دیا ہے، اس کی یہ کتاب کافی مقبول ہوئی، عبداللہ بن الفضل نے اس موضوع سے متعلق اپنی کتاب میں اس سے خوب استفادہ کیا ہے جس کا لاطینی ترجمہ بھی ہوا ہے[1]

تاریخ: اس موضوع پر کتاب "الفردوس" لکھی جو غالباً آرمینیا میں مکمل ہوئی۔

رنگ ریزی: اس موضوع پر کتاب "فی الخضاب" اور کتاب فی العلۃ فی اسوداد الحبش وتغیرہ من الراشی" کا پتہ چلتا ہے۔

زراعت: مترجم کی حیثیت سے قسطوس بن اسکوروس کینا کی تالیف "کتاب الفلاحۃ الرومیۃ" کا ترجمہ کیا تھا، لیکن اس ترجمہ کی پذیرائی نہ ہو سکی، اس کے مقابلہ میں سرجس بن ہلیا کا ترجمہ کافی مقبول ہوا[2]

فلکیات: قسطا بن لوقا کی خدمات فلکیات پر بہت زیادہ ہیں، اس نے فلکی آلات سازی

---

1 اردو دائرہ معارف اسلامیہ ص ۱۳۹ ج ۱۶/۲
2 کشف الظنون ص ۱۳۲ ج ۵ حاجی خلیفہ۔

خصوصیت سے توجہ دی۔[1] اس موضوع پر اس کا کام اس قدر وقیع تھا کہ الفرغانی کی کتاب فلکیات کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا، بعض حلقوں سے یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ اس موضوع سے متعلق کتاب[1] فی عمل الاصطرلاب الکری" کو قسطا بن لوقا کی طرف غلط طور پر منسوب کر دیا گیا ہے، لیکن بعض مورخین نے اس کی زبردست طور پر تردید کی ہے۔[2]

طبیعیات: اس موضوع پر اس کی دو کتابوں "المرایا المحرقة" اور "کتاب الاوزان والمکاییل" کا نام لیا جاتا ہے۔

طب: فن طب میں قسطا بن لوقا کی کافی تصانیف ملتی ہیں، جن میں "کتاب[1] اوجاع النقرس، کتاب[2] فی الرداع وعللها، رسالة[3] فی احوال الباه واسبابه علی طریق المسئلة والجواب، کتاب[4] جامع فی الدخول الی علم الطب، کتاب[5] النبیذ وشربه فی الولائم، کتاب[6] فی العطش، کتاب[7] فی الاغذیة علی طریق القوانین الکلیة کتاب[8] فی النبض ومعرفة الحمیات وضروب البحرانات، کتاب[9] فی علة الموت فجأة، کتاب[10] فی ایام البحران فی الامراض الحادة، کتاب[11] فی الاخلاط الاربعة وما تشترک فیه مختصر کتاب[12] فی الکبد وخلقتها وما یعرض فیها من الامراض کتاب[13] فی تدبیر الابدان فی سفر الحج، کتاب[14] فی دفع ضرر السموم، کتاب[15] فی حرکة الشریان، کتاب[16] فی العضو الرئیس من البدن، کتاب[17] فی البلغم، کتاب[18] فی الدم، کتاب[19] فی المرة الصفراء، کتاب[20] فی المرة السوداء، کتاب[21] الفصد، کتاب[22] الحمام اور کتاب[23] فی الوباء واسبابه شامل ہیں۔

ہندوستان میں قسطا بن لوقا کے مخطوطات	ہندوستان کی جن لائبریریوں میں قسطا بن لوقا کے مخطوطات کا پتہ

[1] المنجد ص ۱۹۶۴ فی الادب والعلوم [2] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ ص ۱۲۹ ج ۱۶ / ۲

چلتا ہے، ان میں خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، رضا لائبریری رام پور اور کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد شامل ہیں، خدا بخش لائبریری میں چھ مخطوطات تاؤ ذوسیوس[1] کی کتاب المساکن اور کتاب الاکر، ابسقلاوس[2] کی کتاب المطالع اور ارسطرخس[3] کی کتاب جرمی النیرین کے ترجمے اور ذاتی تصانیف میں کتاب فی الوباء واسبابه اور کتاب فی حفظ الصحة و ازالة المرض ملتے ہیں، آخر الذکر مخطوطے کا دوسرا کوئی نسخہ اب تک دریافت نہیں ہو سکا ہے[4]، رضا لائبریری کے کیٹلاگ کے مطابق وہاں پانچ مخطوطات محفوظ ہیں، تاؤ ذوسیوس کی کتاب المساکن اور کتاب الاکر، ارسطرخس کی کتاب فی جرمی النیرین اور ابسقلاوس کی کتاب فی المطالع کے عربی تراجم اور ذاتی تصنیف کتاب فی تدبیر الابدان فی سفر الحج، کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد کے مخطوطات کی مطبوعہ فہرست حصہ دوم کے مطابق وہاں صرف ایک مخطوطہ "الکتاب فی تدبیر بدن فی السفر" ہے[5]

[1] یونان کا مشہور مہندس اور ریاضی دان جس کی تصانیف ان فنون پر کافی مشہور ہیں اس کی تصنیف "کتاب الاکر" اتنی عمدہ ہے کہ علماء اسے المجسطی سے کم اور اقلیدس سے زیادہ مرتبہ دیتے ہیں (تاریخ الحکماء ص ۱۶۶ اردو ترجمہ ڈاکٹر غلام جیلانی برق) [2] یونان کا مشہور ریاضی دان جو اقلیدس کے بعد گذرا ہے، کتاب الاجرام والابعاد، کتاب المطالع اور اقلیدس کے چودہویں اور پندرہویں مقالہ کی اصلاح کی (تاریخ الحکماء ص ۱۱۲ اردو ترجمہ) [3] فلسفہ کے لحاظ سے یونانی، مولد کے لحاظ سے اسکندری، علم الفلک کا فاضل، اس کی مشہور کتاب کتاب جرم الشمس والقمر ہے (ایضاً: ص ۱۱۰) [4] خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری (پٹنہ) کیٹلاگ ص ۱۸ ج ۴ [5] رضا لائبریری رام پور کا آخر الذکر مخطوطہ اور آصفیہ حیدرآباد کا مخطوطہ دونوں ایک ہی ہیں۔

لیکن ہندوستان میں قسطا بن لوقا کے مخطوطات کی اس فہرست کو کسی طرح بھی مکمل نہیں کہا جاسکتا، بلکہ بذات خود یہ تحقیق کا ایک اہم موضوع ہے۔

مذکورہ جائزہ سے یہ بات بڑی حد تک واضح ہوجاتی ہے کہ قسطا بن لوقا اپنے وقت کا عبقری تھا عربی طب پر اس کی ذہانت و زبان دانی کے اثرات بڑے واضح اور دیرپا ہیں، مختلف فنون سے اس کی دلچسپی کے ساتھ موضوع طب پر اس کی عالمانہ گرفت نے طب میں ایک معیاری سرمایہ کا اضافہ کیا ہے جس کو ہر دور میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے، اس دور میں اس کی تصانیف کے تفصیلی جائزہ کی ضرورت ہے، طب قدیم کے اسکالرس کو ایسی اہم شخصیتوں کے کارناموں پر نہ صرف توجہ دینی چاہیے، بلکہ ان پر تحقیقی کام بھی کرنا چاہیے۔

اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں

ہندوستان کے اہل علم نے مختلف اسلامی علوم و فنون پر جو کتابیں لکھی ہیں ان کی جامع فہرست اب تک مرتب نہیں ہوئی تھی، حکیم سید عبدالحئی صاحب مرحوم نے الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند کے نام سے ان کتابوں کی ایک فہرست عربی میں لکھ کر اس کمی کو پورا کردیا تھا، جس کا افادہ صرف عربی دانوں تک محدود تھا، اس کا مزید افادہ کے لیے اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے، اس میں ہندوستانی علماء و مصنفین کی مختلف فنون میں تصانیف کے ذکر کے ساتھ ہندوستانی مسلمانوں کی مکمل علمی و تعلیمی، مذہبی و فکری تاریخ بھی قلبند ہوگئی ہے، اس طرح سے یہ کتاب ہندوستان کے اسلامی دور کی تاریخ کے محققین کے لیے ایک بہترین کارآمد ماخذ اور اس کے طلبہ کے لیے ایک اہم کتاب بن گئی ہے، ترجمہ مولانا ابوالعرفان صاحب ندوی، استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء۔

قیمت ۲۰ روپیے "منیجر"

تیسری چوتھی صدی ہجری میں مرکز اسلام بغداد میں
کتابیاتی سرگرمیاں

از جناب مولانا محمد عبدالحلیم چشتی، نائیجریا

عہد عباسی میں علوم کی کثرت و تنوع سے اہل علم کتابیات کی طرف متوجہ ہوئے تاکہ ذخائر علوم سے آگاہی ہو، اہل علم کو اصل ماخذوں تک رسائی ہو اور حصول مواد میں کسی قسم کی دقت نہ ہو، عہد عباسی میں اس اہم کام کو خوش اسلوبی سے انجام دینے کے لیے علماء اور مصنفین نے خود نوشت کتابیات کا سلسلہ شروع کیا، اور انھوں نے مختلف کتب خانوں کے ذخائر سے فائدہ اٹھاکر اپنے مشاہدات و تجربات کی روشنی میں منتخب کتابیات تیار کیں، یہ سلسلہ اتنا پھیلا کہ کتابیات کو مختلف ناموں، فہرس، فہرست، ثبت، تذکرہ، برنامج، مشیخہ و معجم سے یاد کیا جانے لگا۔

عہد عباسی کے اندر تیسری چوتھی صدی ہجری میں ہر موضوع پر ہر موضوعی کتابیات کی ترتیب و تدوین شروع ہوچکی تھی، چنانچہ یعقوب بن اسحاق کندی المتوفی سنہ ۲۶۰ھ/۸۷۳ء کی موضوعی کتابیات[1] اٹھارہ ۱۸ موضوعات اور دو سو چھتیس ۲۳۶ کتابوں پر مشتمل تھی، ان موضوعات پر کتابوں کی تفصیل درج ذیل ہے: (۱) فلسفہ ۲۲ کتب و رسائل، (۲) منطق ۹، (۳) حسابیات ۱۱، (۴) کرویات ۴، (۵) موسیقیات ۷، (۶) نجومیات ۱۵، (۷) ہندسیات ۲۳، (۸) فلکیات ۱۹، (۹) طبیات ۲۰، (۱۰) احکامیات ۱۰، (۱۱) جدلیات ۱۹، (۱۲) نفسیات ۵، (۱۳) سیاسیات ۱۲، (۱۴) احداثیات ۱۴، (۱۵) ابعادیات ۸، (۱۶) تقدمیات ۵، (۱۷) انواعیات ۳۳۔

موضوعی کتابیات | موضوعی کتابیات ارباب فن اور نامور اہل علم سے تیار کرائی جاتی تھیں چنانچہ حنین بن اسحاق (۱۹۴ھ/۸۱۰ء ۔ ۲۶۰ھ/۸۷۳ء) نے علی بن یحیٰی کے لیے جالینوس کی کتابیات (فہرست جالینوس)

---

[1] ملاحظہ ہو کتاب الفہرست لابن ندیم ۔ المطبعۃ الرحمانیۃ، مصر ۱۳۴۸ھ، ص ۳۵۸ ۔ ۳۶۵۔

مرتب کی تھی۔ اس کے مطالعہ کی روشنی میں ابن ندیم نے یہ کہا ہے کہ حنین کے بیشتر ترجمے سریانی میں تھے، اور یہ اس کی خوش قسمتی ہے کہ حبیش اعسم اور عیسیٰ ابن یحییٰ نے جن کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا ہے وہ بھی حنین سے منسوب کی گئی ہیں[1]۔ ابوبکر محمد رازی المتوفی ۳۳۱ھ / ۹۲۳ء نے اس کتابیات پر استدراک "کتاب فی استدراکات ما بقی من کتب جالینوس مالم یذکرہ حنین ولا جالینوس فی فہرستہ" کے نام سے لکھا تھا[2]۔ رازی نے پہلی مرتبہ کتابیاتی دنیا میں تحقیق کا دائرہ یہاں تک بڑھایا کہ خود جالینوس سے جن کتابوں کا تذکرہ رہ گیا تھا اس کا کھوج لگایا اور علمی دنیا کو واقفیت کے لیے پیش کیا،

یحییٰ بن عدی المتوفی ۳۶۴ھ / ۹۷۵ء نے ارسطو (۳۸۴ ۔ ۳۲۲ قم) کی تصانیف اور ان کی شروح پر مشتمل "فہرست کتب ارسطاطالیس" مرتب کی تھی، ابن ندیم نے یہ فہرست یحییٰ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی دیکھی تھی[3]۔ لیکن خود اس نے یحییٰ کی تصانیف میں اس کتابیات کا ذکر نہیں کیا ہے[4]۔ اور نہ القفطی وغیرہ نے اس کی طرف کوئی اشارہ کیا ہے[5]۔ یہ اس امر کی نہایت واضح دلیل ہے کہ اس قسم کی کتابیات اس دور میں تیار کی جاتی تھیں لیکن ہر مقام پر ان کے بیان کرنے کا اہتمام نہیں کیا جاتا تھا۔

فہرست اسماء الخطباء والبلغاء، ابو علی ابن مقلہ خطاط المتوفی ۳۲۸ھ نے طبقات پر مرتب کی تھی، ابن ندیم نے اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ فہرست دیکھی تھی، اس نے اسی ترتیب و الفاظ کے ساتھ اسے کتاب الفہرست میں نقل کیا ہے[6]۔ مورخ ہشام کلبی المتوفی ۲۰۴ھ اور مدائنی المتوفی ۲۱۵ھ کی تصانیف کی موضوعی فہرست بخط ابوالحسن بن الکوفی المتوفی ۳۴۸ھ / ۹۶۰ء کو اسی ترتیب و عنوانات کے ساتھ من وعن الفہرست میں نقل کیا ہے[7]۔

---

[1] کتاب الفہرست لابن الندیم المطبعۃ الرحمانیہ، مصر ۱۳۴۸ھ، ص ۴۰۳ [2] ایضاً، ص ۴۱۷۔ [3] ایضاً ص ۳۵۱ ۔ ۳۵۲ [4] ایضاً ص ۳۶۹ [5] تاریخ الحکماء للقفطی طبع لیپزگ ۱۹۰۳ء ص ۳۶۱ [6] کتاب الفہرست لابن الندیم ص ۱۸۲ [7] ایضاً ص ۱۴۰ ۔ ۱۴۳ و ۱۴۷ ۔ ۱۵۲۔

تیسری صدی ہجری کے اوائل میں مصنفین کی موضوعی اور دوسری قسم کی کتابیات تیار کیے جانے کا رواج ہو گیا تھا، چنانچہ جابر بن حیان المتوفی ۲۰۰ھ / ۸۱۵ء کے نامور شاگرد خرقی کی تصانیف کی دو فہرستیں تھیں، ایک فہرست کبیر کیمیا اور دوسرے موضوعات پر تھی، اور دوسری فہرست صغیر تھی، جو صرف علم کیمیا کی کتابوں پر محیط تھی[1]۔

ابن ندیم بحیثیت فہرست نگار و کتاب شناس اور کتاب الفہرست کی خصوصیات

تیسری صدی ہجری میں ہر موضوع پر کتابوں کی کثرت کی وجہ سے اہل علم موضوعی کتابیات کی ترتیب کی طرف مائل ہوئے، پھر چوتھی صدی ہجری میں ابوالفرج محمد بن اسحاق الوراق الندیم نے فہرس الفہارس (کتابیات کی کتابیات) ترتیب دی، اس دور میں فہرس الفہارس کی اصطلاح ایجاد نہیں ہوئی تھی اس لیے ابن ندیم نے اس وسیع مفہوم کو حسب ذیل الفاظ میں ادا کرنے کی کوشش کی ہے:

"یہ عرب و عجم کی ان تمام (منتخب) کتابوں کی فہرست ہے جو عربی زبان میں لکھی گئی تھیں یا مختلف علوم و فنون سے عربی میں منتقل کی گئی تھیں"[2]۔

ظاہر ہے ان کا احاطہ کتابیات کے بغیر کیسے ممکن تھا، غالباً اسی جامعیت کی وجہ سے ابن ندیم نے اس کتاب کا نام سیبویہ کی الکتاب کی طرح "الفہرست" رکھا، جو اس امر کا غماز ہے کہ یہ کتاب الفہرست علم کتابیات کی جملہ مروجہ معلومات و مدونہ کتابیات کو حاوی ہے، یہ بھی ملحوظ خاطر رہنا چاہیے کہ محمد ابن اسحاق الندیم نے اگرچہ "ہذا فہرست کتب جمیع الامم من العرب والعجم الموجود منہا بلغۃ العرب الخ" کے الفاظ لکھے ہیں، لیکن کتاب کے مطالعہ و استقراء سے معلوم ہوتا ہے کہ "جمیع" کا لفظ کثرت کتب کے اعتبار سے لایا گیا ہے، اس سے مراد مصنفین وغیرہ کی مشہور و متداول کتابوں کا تذکرہ ہے، جیسا کہ ابن ندیم نے فقیہ زعفرانی المتوفی ۲۶۰ھ کے تذکرہ میں کہا ہے کہ "ہمیں زعفرانی کی روایت کردہ

---

[1] ملاحظہ ہو الفہرست لابن الندیم ص ۵۰۰ [2] ایضاً ص ۲۹۷

مصنفین کے علمی مقام کو واضح کرنے اور ان کی تصنیفات کی اہمیت کو بیان کرنے کے لیے امام فن کا قول پیش کیا ہے، مثلاً اصمعی کے بارہ میں کہا ہے کہ ابو العباس مبرد کا قول ہے کہ اصمعی شعر و معانی میں سب سے برتر ہے، یہی حال ابو عبیدہ کا ہے، لیکن وہ علم نسب میں اصمعی سے بلند تر تھا اور اصمعی علم نحو کا اس سے بڑا عالم تھا۔[1] اس نوع کے تبصرے متعدد مقامات پر کیے ہیں۔[2] الفہرست کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ چوتھی صدی ہجری میں تشریحی کتابیات کا آغاز ہو چکا تھا، چنانچہ ابن ندیم نے الفہرست میں کتاب کے طرز و انداز کو بھی بتایا ہے، مثلاً ابن قتیبہ کی کتاب ادب الکاتب کے متعلق لکھا ہے کہ یہ معارف ابن قتیبہ کی طرح ہے۔[3]

مصنفین کے طرز تصنیف کی طرف بھی اشارہ کیا ہے مثلاً کہا کہ فلاں مصنف کو تصنیف کا اچھا سلیقہ تھا۔[4] فلاں مصنف فلاں کے انداز پر کتاب لکھتا ہے۔[5] یا فلاں فلاں میں یہ فرق ہے اور ان میں فلاں زیادہ ماہر ہے۔ مثلاً فرا اپنی تصانیف میں فلاسفہ کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔[6] ابو زید بلخی کی فلسفیانہ تصانیف فلاسفہ کی بہ نسبت اہل ادب سے زیادہ قریب ہیں، اس لیے ان کا ذکر بھی ادبا کے زمرے میں کیا گیا ہے۔[7] اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عہد عباسی میں فہرست ساز اسالیب تصانیف پر بھی گہری نظر رکھتا تھا۔ الفہرست اس دور کی تصانیف کے اسلوب پر بھی روشنی ڈالتی ہے، کوئی کتاب اگر کسی مصنف سے منسوب ہوتی ہے تو اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔[8] کسی مصنف نے بہت سے موضوعات پر کتابیں لکھی ہیں تو اس کا ذکر کیا ہے اور اس کی کتابوں

---

[1] ملاحظہ ہو کتاب الفہرست لابن الندیم ص ۸۲، ۱۳۷، ۱۴۰ [2] ایضاً ص ۸۰، ۲۱۶، ۱۳۷۔
[3] ایضاً ص ۹۲۔ ۱۶۶ [4] ایضاً ص ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۲۰، ۲۲۱ [5] ایضاً ص ۱۶۴، ۲۲۳، ۲۲۸ [6] ایضاً ص ۲۱۰ [7] ایضاً ص ۹۹، ۱۶۳ [8] ایضاً ص ۱۹۸۔
[9] ایضاً ص ۲۱۴ (تذکرہ کسروی)

کتابوں کو نام بہ نام ذکر کرنے کی حاجت نہیں، اس لیے کہ وہ زیادہ تر فنا ہو چکی ہیں اور تصنیف کے بعد وہ نقل بھی نہیں کی گئی ہیں۔[1] بعض کے متعلق کثیر التصانیف ہونے کی تصریح کر کے ان کی چند تصانیف کو بیان کرنا[2] یا کسی مصنف کے بارے میں اس کا "ومن کتبہ الخ"[3] اور "ولہ من الکتب الخ" اس کی کتابوں میں سے یہ کتب ہیں[4] کے الفاظ لکھنا پھر فہارس کو موضوعی کتابیات مصنفین کو ہر مقام پر من وعن نقل نہ کرنا، بلکہ بعض مقام پر انہی کتابوں کو درج کرنا جن کو خود دیکھا یا معتبر لوگوں سے سنا ہے، یہ وہ قرائن ہیں جو تصانیف کے دائرہ کو منتخب و متداول کتابوں تک محدود رکھنے کی دلیل ہیں، اس نے چونکہ اپنے زمانہ میں پائی جانے والی کتابوں کا بھی اندراج کیا ہے، اس لیے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ گذشتہ عہد کی کتابیات ہی نہ تھی بلکہ یہ رواں کتابیات بھی تھی۔

الفہرست میں کتابوں کے ناموں کے اندراج میں کتاب کے معروف و غیر معروف دونوں نام نقل کرنے کا اہتمام کیا گیا، تاکہ کتابیات سے فائدہ اٹھانے والے کو اشتباہ نہ ہو، مثلاً ابو عبد الرحمن محمد ضبی کی کتاب "الزکاۃ" کے متعلق کہا ہے کہ یہ کتاب السنن[5] یا وکیع کی کتاب الطریق نواحی کے نام سے بھی مشہور ہے۔[6]

مشتبہ مقام پر ماں باپ کے نام کی نسبت کو بھی ظاہر کیا گیا ہے، مثلاً محمد بن حبیب کے متعلق کہا ہے کہ حبیب ماں کا نام ہے۔[7] اور اسماعیل بن علیہ کی نسبت کہا ہے کہ علیہ ماں کا نام ہے۔[8] کہیں لقب کے معنی اور وجہ لقب کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، مثلاً قطرب کے معنی حرکت کناں کیڑا ہے چونکہ قرار نہیں تھا، یہ سیبویہ کے پاس سویرے ہی آجاتا تھا اس لیے اس نے اس کا نام ہی قطرب رکھا تھا۔[9]

---

[1] الفہرست لابن الندیم ص ۷، ۲۹ [2] ایضاً ص ۲۰۹ [3] ایضاً ص ۲۰۵ [4] ایضاً ص ۱۰۷، ۲۰۶، ۳۳۰، ۳۶۰، ۵۰۷ [5] ایضاً ص ۳۱۶ [6] ایضاً ص ۱۳۶ [7] ایضاً ص ۵۵ [8] ایضاً ص ۸۰ [9] ایضاً ص

قدر و قیمت کو کتب خانہ کے نقطۂ نظر سے بتایا ہے[1]

وہ مصنفین جن کی تصانیف کی طرف اہل علم کی توجہ حسن ضبط کی[2] یا حسن خط کی وجہ سے رہی ہے[3] اس کی طرف اشارہ کیا ہے، اور اگر کسی خاص شہر میں ان کو قبول عام حاصل رہا ہے اس کو بھی بتایا ہے[4]۔ مختلف مرتب دواوین کے اشعار کی تعداد کو بھی بیان کیا ہے[5]، کسی مشہور عالم کی کوئی کتاب نظر سے نہیں گذری، صرف مسودات ہی مطالعے سے گذرے ہیں تو اس کی طرف بھی اشارہ کیا، گویا علمی و تحقیقی ورثے کو نظر انداز نہیں کیا ہے، چنانچہ بلخی فلسفی کے متعلق لکھا ہے کہ اس کے مسودات اہل علم کے پاس بہت دیکھے ہیں، لیکن کوئی پوری کتاب نہیں دیکھی، یہ کہا جاتا ہے کہ خراسان میں اس کی تصانیف موجود ہیں[6]، رازی نے اس کی تصانیف کو اپنی تصانیف قرار دیا ہے[7]، مشترک مصنفین کی نشاندہی بھی کی ہے[8]

ابن ندیم نے جگہ جگہ کتابوں کے اوراق کی تعداد بتائی ہے، ایک مقام پر تصریح کی ہے کہ بغیر کسی نسبت کے ورق کا ذکر کیا گیا ہے، اس سے ورق سلیمانی مراد ہے جو بیس[20] سطری ہوتا ہے، ہر شاعر کے کلام کی تعداد کو اسی ورق میں بیان کیا ہے، تاکہ ان کے کلام میں کمی بیشی کی نشاندہی ہو سکے، جو شخص ان کی کتابیں اور شعر جمع کرنے کا خواہاں ہے وہ علی وجہ البصیرت اس سے آگاہ رہے، ہمارا یہ اندازہ تقریبی ہے، تحقیقی نہیں[9]۔ اس کی روشنی میں یہ کہنا بجا ہے کہ عہد عباسی میں کتابیات کے Collation کا بھی اہتمام کیا جاتا تھا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب الفہرست کی تدوین کی غایت اہل علم میں کتابوں سے متعلق

---

[1] ملاحظہ ہو کتاب الفہرست ص ۳۱۴ (تذکرۂ مروزی) ۱۹۰ (المرزبانی) [2] ایضاً ص ۱۲۰۔
[3] ایضاً ص ۱۱۶ - ۱۱۸ [4] ایضاً ص ۱۱۵ . ۱۲۴ . ۲۷۵ [5] ایضاً ص ۲۳۵ . ۲۴۰ - ۲۴۱.
[6] ایضاً ص ۴۱۹ [7] ایضاً [8] ایضاً ص ۳۸۵ (تذکرۂ بنو الصباح) [9] ایضاً ص ۲۲۶۔

مفید معلومات فراہم کرنا، ذخائر کتب میں اضافہ و انتخاب میں مدد و آسانی پیدا کرنا تھا، ان ہی مقاصد کے پیش نظر ایک صنف کے نامور مصنفین کو تقدم و تاخر زمانی و مکانی اور ترتیب حروف تہجی کا لحاظ کیے بغیر ہر مقام پر ایک ہی جگہ بیان کیا ہے، پوری کتاب میں اس کا یہی انداز ہے[1]، ابن ندیم کے بعد بھی فہرست نگاروں نے مذکورۂ بالا اصول کو اپنایا ہے، جیسا کہ ابن خیر کی فہرست ما رواہ عن شیوخہ سے ظاہر ہے.

ابن ندیم نے کسی اہم کتاب کا نسخہ کسی کے پاس دیکھا ہے تو اس کی تفصیل پیش کی ہے، مثلاً کتاب القبائل والایام محمد بن حبیب اخباری المتوفی ۲۴۵ھ کے متعلق لکھا ہے کہ یہ کتاب موصوف نے فتح بن خاقان کے لیے تصنیف کی تھی، اس کا اصل نسخہ ابوالقاسم بن ابی الخطاب بن فرات کے پاس دیکھا، یہ طلحی کاغذ پر تیس[30] سے کم اجزاء پر مشتمل تھا، اس نسخہ کی ظاہری ہیئت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ اصل مقدار سے کم ہے، اس کا ہر جزء دو سو[200] یا اس سے زیادہ اوراق پر مشتمل تھا، اس نسخہ کی فہرست طلحی کاغذ کے پندرہ[15] اوراق پر خط جرک بن تستری بن علی وراق کی لکھی ہوئی ہے، اور یہ فہرست قبائل اور ان کی سرگذشت ایام پر محیط ہے[2]، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مضامین کتاب سے اہل علم کو روشناس کرانے اور تعیین موضوع میں فہرست سازوں اور درجہ بندی کرنے والوں کی رہنمائی کے لیے تیسری صدی ہجری کے نصف اول ہی میں فہرست کتاب کے شروع میں لگانے کی ابتداء ہو چکی تھی اور اس اہم کام کے آغاز کا سہرا محمد بن حبیب بغدادی کے سر ہے[3]

---

[1] ملاحظہ ہو کتاب الفہرست ص ۶۵، ۲۰۹، ۲۱۰ [2] ایضاً ص ۱۵۵، ۱۵۶ [3] معجم الادباء لیاقوت طبع دوم مطبعہ ہندیہ مصر ۱۹۲۵ء ج ۶ ص ۴۷۶ و کتاب المحبر از محمد بن حبیب مطبعۃ دائرۃ المعارف العثمانیہ ۱۳۶۱ھ ص ۵۱۰، ۵۱۱ (کلمۃ اختتام للکتاب لمحمد حمید اللہ) ص ۵۱۰، ۵۱۱

فہرست مضامین کتاب کے لیے لفظ ثبت کا استعمال

ابن ندیم نے فہرست مضامین کتاب کے لیے "ثبت" کا لفظ بھی استعمال کیا ہے، چنانچہ نضر بن شمیل المتوفی سنہ ۲۰۲ھ کی کتاب الصفات کے متعلق لکھا ہے کہ "بڑی کتاب ہے، ابو عبید نے غریب المصنف میں اس سے استفادہ کیا ہے، میں نے اس کا ثبت ابو الحسن بن کوفی کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیکھا ہے، جو من و عن نقل کرتا ہوں پھر ہر جلد کے مضامین کی فہرست پیش کی ہے"[۱]

مصطلحات فن کتابیات کا استعمال

ابن ندیم نے مصطلحات فن کو استعمال کیا، مثلاً زائدہ ابن قدامہ الشہید المتوفی سنہ ۳۶۱ھ کی کتاب السنن کے لیے لکھا ہے کہ یہ انہی ابواب پر مشتمل ہے جن پر کتاب السنن مشتمل ہوتی ہے جیسے کتاب الطہارۃ، صیام و صلوٰۃ وغیرہ[۲]

الف بائی ترتیب کی وضاحت کے لیے مثلاً دو لفظ عملہ علی حروف المعجم اور علی الحروف کی اصطلاح استعمال کی ہے[۳]، اس کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلم مرتبین کتابیات نے تشریحی اندراجات میں ایسی معلومات پیش کیں جو اہل علم کی ترغیب کا باعث ہوئیں، یہی وجہ ہے کہ صرف موضوع ہی نہیں خود کتاب سے آگاہی بھی اس دور میں اہل علم کو مطالعۂ کتاب پر آمادہ کرنے کے لیے کافی تھی، اس سے یہ حقیقت بھی روشن ہو جاتی ہے کہ ابن ندیم نے کتابیاتی اندراجات میں موجودہ کتابوں کے نادر نسخوں سے بھی اعتنا نہیں کیا، بلکہ قدیم نادر و نایاب کتب کی توجہ اہل علم کی طرف منعطف کرانے کے لیے تشریحی کتابیات پیش کرنے میں کوتاہی نہیں کی ہے۔

ابن ندیم نے کتابوں کے متعلق معلومات فراہم کرنے میں ان ماخذوں کی نشاندہی بھی کی ہے، چنانچہ جن کتابوں کو بچشم خود دیکھا ہے، ان کے کاتبوں کے نام کی تصریح کی ہے[۴] اور جن علماء سے

---

۱ کتاب الفہرست ص [illegible] ۲ ایضاً ص ۳۱۶ ۳ ایضاً ص ۲۰۰، ۲۱۳، ۲۳۵۔
۴ ایضاً ص ۱۱۷، ۴۲۳

معلومات حاصل کی ہیں ان کا بھی حوالہ دیا ہے[۱] کبھی دو فنون کی کتابوں کو ایک مقام پر دو عنوان سے پیش کیا ہے[۲]، بعض موضوع پر ایسی مشہور کتابوں کو جن کے مصنفین کا علم نہیں ہے ان کو بھی فہرست میں جگہ دی ہے[۳]، اپنے معاصر مصنفین کا ذکر مشہور و ہمعصر ہونے کی وجہ سے نہایت مختصر کیا ہے[۴]

بعض قرائن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن ندیم نے بعض مقامات پر کتابیں بروقت دستیاب نہ ہونے یا ان کے مولفین کے متعلق معلومات فراہم نہ ہونے کی وجہ سے بیاض چھوڑ دی، تاکہ معلومات حاصل ہو جانے کی صورت میں ان کا اضافہ کیا جا سکے، اس نوع کے اضافہ کا اختیار ناظرین کو بھی دیا ہے[۵]

مندرجۂ بالا امور کی روشنی میں یہ کہنا بجا ہے کہ کتابیات کی تاریخ کے اندر کتب خانے کے نقطۂ نگاہ سے تبصرے، تنقید، جائزے اور تعارف کتب کی طرح سب سے پہلے ابن ندیم نے ڈالی، نیز عہد عباسی میں کتاب کی ظاہری و باطنی ہیئت کو نمایاں کرنے کی سعی بلیغ کی، اگرچہ بعض علمی دشواریوں کی وجہ سے ہر جگہ ان امور کا التزام نہیں کیا جا سکا ہے، تاہم جہاں بسہولت ممکن ہو سکا مذکورۂ بالا امور کی روشنی میں کتاب کے ہر دو رخ کی تصویر کشی کی گئی ہے، آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی مخطوطات کی ظاہری و باطنی ہیئت کو نمایاں کرنے کے لیے مذکورۂ بالا امور کو پیش نظر رکھا جاتا ہے جو ابن ندیم کے وضع کردہ رہنما اصول کی افادیت و اہمیت اور مقبولیت کا نہایت بین ثبوت ہے۔

ابن ندیم پہلا ماہر کتابیات ہے جس نے چوتھی صدی ہجری میں کتابیاتی اندراج میں تنوع و وسعت پیدا کی اور کتابیاتی مواد کے قوام میں ایسے بنیادی اجزاء کو شامل کیا جن کے اندراج کے بعد کتاب کا پورا تعارف و تشخص ہو جاتا اور کتاب کے طلبگار کو کتاب کی ظاہری و باطنی ہیئت کو سمجھنے میں

---

۱ ملاحظہ ہو کتاب الفہرست ص ۴۳۲ ۲ ایضاً ص ۱۲۶ ۳ ایضاً ص ۳۴۵ ۴ ایضاً ص ۳۰۰۔

۵ ایضاً ص ۲۰۳ (الزیدیہ)

کوئی تشنگی باقی نہیں رہتی ہے، کتابیاتی مواد کے اندراج میں جن بنیادی اجزاء کو شامل کیا گیا ہے، وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) مصنف (۲) کتاب (۳) ایڈیشن (۴) مقام اشاعت (۵) ناشر (۶) تاریخ اشاعت کتاب (۷) تعداد اوراق (۸) اجزاء و مجلدات

اس ترقی یافتہ دور میں ان اجزاء میں سے تین جزء (۱) مقام اشاعت (۲) ناشر (۳) تاریخ اشاعت کو Imprint کے نام سے یاد کیا جاتا اور کیٹلاگنگ کے بنیادی اجزاء میں اس کا شمار کیا جاتا ہے، بقیہ اجزاء کو Collation میں داخل کیا گیا ہے۔

اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی کتابیاتی اندراج اور کیٹلاگنگ دونوں میں قدرے تغیر و اصلاح کے ساتھ ابن ندیم کی وضع کردہ اساس پر عمل کیا جاتا ہے جو اس کے کتابیاتی مواد کے اندراجی اجزاء کے انتخاب، ساخت اور ان کی صحت نیز اس کی بنائی اور اپنائی ہوئی مبادی کی اہمیت، افادیت و استحکام کی نہایت روشن دلیل اور اس کے ذہن کی جدت و اختراع، فن کتابیات سے طبعی مناسبت، اس فن میں اس کی مجتہدانہ بصیرت کی شاہد عدل ہے۔

کتابوں میں حوالوں کا اہتمام اور کتابیات کا آغاز

عہد عباسی میں جب تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع ہوا اور کتابیں استعمال میں آنے لگیں تو علماء اور مصنفین اپنی کتابوں میں حسب ضرورت ان کے حوالے دینے لگے تھے، چنانچہ تیسری صدی ہجری میں غالباً سب سے پہلے امام ابو عیسیٰ ترمذی المتوفی ۲۷۹ھ نے کتاب العلل میں ائمۂ فن کی کتابوں کا حوالہ دیئے اور اپنے پیش نظر ماخذوں کی نشاندہی کرنے کا اہتمام کیا تھا، چنانچہ موصوف کتاب العلل میں رقمطراز ہیں:

"جامع ترمذی میں جو باتیں علل احادیث، رجال و تاریخ کی بیان کی ہیں وہ میں نے بخاری کی التاریخ الکبیر سے لی ہیں اور اقوال فقہاء اور علل حدیث کے سلسلہ میں پیشوایانِ فن ہشام

بن حسن (المتوفی سنہ ۱۴۷ھ) عبدالملک بن عبدالعزیز بن جریج (المتوفی سنہ ۱۵۰ھ) سعید بن ابی عروبہ (المتوفی سنہ ۱۵۶ھ) مالک بن انس (المتوفی سنہ ۱۷۹ھ) حماد بن سلمہ (المتوفی سنہ ۱۶۷ھ) عبداللہ بن المبارک (المتوفی سنہ ۱۸۱ھ) یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ (المتوفی سنہ ۱۸۲ھ) وکیع بن الجراح (المتوفی سنہ ۱۹۷ھ) عبدالرحمن بن مہدی (المتوفی سنہ ۱۹۸ھ) وغیرہ اہل علم و فضل کی تصانیف پیش نظر رہی ہیں"[1]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد عباسی میں دوسری اور تیسری صدی ہجری کے اندر تصانیف کا سلسلہ اتنا بڑھ گیا تھا کہ ایک عالم دوسرے عالم کی کتابوں کا حوالہ دیتا تھا، حوالہ کی صورت بھی ترقی پذیر رہی ہے، چوتھی صدی میں جب ہر موضوع پر کتابوں کا ذخیرہ زیادہ فراہم ہو گیا تو مصنفین نے اوائل کتاب میں اپنے ماخذوں کی نشاندہی کرنا ضروری قرار دیا تاکہ قاری کو موضوع سے متعلق مصنف کے پیش نظر تحقیقی و مستند نسخوں کا علم ہو سکے اور اقتباسات کو سمجھنے میں مدد مل سکے، نیز مصنف کی کتاب بھی مستند سمجھی جائے، کبھی ایسا کیا جاتا تھا کہ مصنف کتابیات کی وضاحت جداگانہ رسالہ میں کرتا تھا، چنانچہ ابو داؤد سجستانی المتوفی ۲۷۵ھ/ ۸۸۹ء نے کتاب السنن کی کتابیات ایک مستقل رسالہ میں جو رسالۃ ابی داؤد الی اہل مکہ فی وصف سننہ کے نام سے موسوم ہے، بیان کی تھیں[2]۔ ان مقاصد کے پیش نظر مصنف ابتدا میں کبھی کتابوں کے نام نقل کرتا اور کبھی کتاب کے آخر میں ذکر کرتا اور بعض مواقع پر دوران بحث دوسرے مصنفین کی شہادتوں پر اعتماد کر کے حوالوں سے کتاب کو زینت دیتا جو اس کے خزائن کتب یا اس کی دسترس میں نہیں ہوتی تھیں، تاکہ جب کبھی اور جہاں کہیں قاری کو وہ کتابیں مل سکیں، وہ ان سے استفادہ

---

[1] ملاحظہ ہو سنن الترمذی، مطبع العلوم دہلی، سنہ ۱۲۶۵ھ، ص ۶۴۷۔ [2] رسالۃ ابی داؤد الی اھل مکۃ فی وصف سننہ، تحقیق محمد الصباغ، اضواء الشریعۃ عدد پنجم، جمادی الاولیٰ ۱۳۹۴ھ، ص ۲۷۸۔

کرسکے، چنانچہ ابن فارس المتوفی ۳۹۵ھ نے معجم مقائیس اللغۃ میں کتابیات کے اس اسلوب کو اختیار کیا، اور مقدمۂ کتاب میں بنیادی پانچ کتابوں، کتاب العین خلیل، کتاب غریب الحدیث ابوعبید، کتاب المنطق ابن السکیت، کتاب الجمہرۃ ابن درید کو بیان کرکے لکھا کہ ان کے علاوہ لغت کے موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، وہ بھی پیش نظر رہی ہیں، ہم نے جو کچھ لکھا ہے وہ ان کتابوں سے ماخوذ ہے۔[1]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان مصنفین نے تیسری صدی ہجری میں کتاب کے آخر میں اور چوتھی صدی ہجری میں آغاز کتاب میں کتابیات پیش کرنے کی جو اساس قائم کی تھی، اس پر بادنیٰ تصرف آج تک عمل جاری ہے، یہ طرز عمل قاری کی مصنفین اور کتابوں تک رہنمائی میں مدد دیتا اور کتابیاتی مقاصد کو پورا کرتا تھا۔

مواد کی حیثیت اور تبصرہ

پانچویں صدی ہجری میں کتابیات کے استعمال کا رواج عام ہوگیا تھا، مورخ اسلام ابن عبدالبر المتوفی ۴۶۳ھ نے الانباہ علی قبائل الرواۃ میں جن کتابوں سے استفادہ کیا، ان کو مقدمۂ کتاب میں نام بہ نام شمار کراکر کہا ہے:

"میں نے اس کتاب کو انساب کی بنیادی کتابوں سے ترتیب دیا ہے، جن میں (۱) کتاب ابی بکر محمد بن اسحاق (۲) کتاب ابی المنذر ہشام بن محمد بن سائب کلبی (۳) کتاب ابی عبیدہ معمر بن المثنیٰ (۴) کتاب محمد بن عبدہ ابن سلیمان (۵) کتاب محمد بن حبیب (۶) کتاب نسب قریش ابوعبداللہ احمد بن محمد بن عبید عدوی (۷) کتاب نسب قریش زبیر بن بکار (۸) کتاب نسب قریش مصعب بن عبداللہ زبیری (۹) کتاب انساب العرب علی بن کیسان کوفی (۱۰) کتاب علی بن عبدالعزیز جرجانی (۱۱) کتاب

[1] معجم مقائیس اللغۃ لابن فارس عیسی العالی الحلبی قاہرہ ۱۳۶۶ھ ج ۱، ص ۳-۵

عبدالملک بن حبیب اندلسی۔ اس کے علاوہ فقرے اور جملے میں نے حدیث و آثار اور کتب تاریخ و ادب سے لیے ہیں۔"[1]

موصوف نے جب الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب لکھی تو اس میں بھی کتابیات کو آغاز کتاب میں بیان کیا اور فرمایا:

"میں نے اس کتاب میں جو لکھا ہے، وہ موسیٰ بن عقبہ کی کتاب سے[2] ابن اسحاق کی کتاب سے[3] طبقات واقدی سے[4] تاریخ واقدی سے منقول ہے۔[5] بعض کتابیں نہیں مل سکیں، ان کا حوالہ دوسری کتابوں کے حوالے سے نقل کیا، ان کو بھی بتا دیا ہے، مثلاً ہم نے جو مصعب بن عبداللہ، ابن المدائنی اور ابومعشر کے حوالے سے نقل کیا ہے وہ کتاب ابن ابی خیثمہ سے ماخوذ ہے،[6] تاریخ بخاری، تاریخ ابوالعباس محمد بن اسحاق سراج، ابن جریر طبری، ذیل المذیل، ابوالبشر دولابی کی کتاب المولد والوفاۃ سے مستفاد ہے، صحابہؓ کی جنگ، شہادت، آنحضرتؐ کی زیارت، ملاقات، اسلام یہ باتیں طبقات کبیر ابن سعد سے لکھی ہیں، اس کے علاوہ جو باتیں ہیں، وہ ابوعلی سعید بن عثمان بن السکن کی کتاب "الحروف فی الصحابہؓ" اور ابومحمد جارود کی کتاب الصحابہ، کتاب ابوجعفر عقیلی اور کتاب ابن ابی خیثمہ سے منقول ہے، میں نے ابن ابی حاتم رازی کی کتاب اور ازرق دولابی یعقوبی کی کتاب الصحابہ کا بھی مطالعہ کیا ہے، اس کتاب میں ان کتابوں کے علاوہ بھی معلومات ہیں جو شیوخ سے سنی ہیں، اور انساب کی کتابوں کا تذکرہ ہم نے کتاب الانباہ میں کیا ہے۔[7]

[1] ملاحظہ ہو الانباہ علی قبائل الرواۃ ص ۴۵-۴۶ یہ کتاب القصد والامم فی التعریف باصول انساب العرب والعجم کے ساتھ مطبعۃ السعادۃ قاہرہ سے ۱۳۵۰ھ میں شائع ہوئی تھی۔ [2] الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، تحقیق علی محمد البجاوی مطبعۃ نہضۃ مصر ۱۳۸۰ھ ج ۱ ص ۲۰-۲۱ [3] ایضاً ص ۲۲ [4] ایضاً ص ۲۳ [5] ایضاً [6] ایضاً ص ۲۴ [7] ایضاً ص ۲۵۔

شمس طبسی کے کلام کا ایک قدیم مجموعہ

از

ڈاکٹر ریحانہ خاتون، لکچرر شعبۂ فارسی، دلی یونیورسٹی۔

شمس طبسی کا پورا نام شمس الدین محمد بن عبد الکریم تھا شمس اواخر چھٹی اور اوائل ساتویں صدی ہجری کا مشہور شاعر گذرا ہے، اس کا تذکرہ لباب الالباب عوفی (تالیف سنہ ۶۱۸ھ) اور آثار البلاد قزوینی (تالیف سنہ ۶۷۴ھ) میں خصوصیت سے پایا جاتا ہے، عوفی اس کا معاصر تھا، اور اس نے بخارا میں اس کو صدر الدین محمد نظام الملک کے دربار میں دیکھا تھا، اسی وزیر کی مدح میں شمس طبسی کے کئی منظومات ہیں، شمس کا تعلق طبس، خراسان سے تھا، وہ رضی الدین نیشاپوری کا شاگرد اور خاقانی کا معاصر تھا، محمد عوفی نے اس کو اس عہد کے تین [۳] اور ہم نام شعراء سے بہتر بتایا ہے، اور مولف آثار البلاد قزوینی کے نزدیک اس کے اشعار خاقانی سے بہتر ہوتے تھے، سال وفات سنہ ۶۲۴ھ سنہ ۶۲۶ھ بتائی جاتی ہے۔

شمس طبسی خاصا مقبول شاعر تھا، اس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ شعراء کی اکثر بیاضوں میں اس کے متعدد منظومات نقل ہیں، اس سلسلہ میں مونس الاحرار کلاتی (سنہ ۷۰۲ھ) مونس الاحرار جاجرمی (سنہ ۷۴۱ھ) مجموعۂ لطایف و سفینۂ ظرایف ہروی (سنہ ۸۰۲ھ) مجموعۂ قصائد نسخۂ علی گڑھ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، ان میں سب سے زیادہ جاجرمی نے اپنے مجموعہ میں اس کے اشعار شامل کیے ہیں۔

شمس طبسی کے دیوان کے نسخے کم پائے جاتے ہیں، ایرانی دانشمند تقی بینش نے جن کی توجہ سے دیوان کا ایک انتقادی متن شائع ہوا ہے، سات نسخوں کا ذکر کیا ہے، جن میں سے دو نہایت قدیم ہیں، ایک چیسٹر بیٹی کلکشن ڈبلن میں ہے، جس کی کتابت سنہ ۶۹۹ھ میں ہوئی، اور دوسرا نسخہ انڈیا آفس لندن کا ہے، جو سنہ ۷۱۳ھ کا مکتوبہ ہے، اور نسخے دسویں صدی سے لے کر چودھویں صدی ہجری کے ہیں۔

شمس طبسی کے دیوان کا ایک مجموعہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کتب خانہ میں ہے، جس کی کتابت سنہ ۷۲۱ھ میں ہوئی، گویا اس شاعر کے تمام دریافت شدہ نسخوں میں باعتبار قدامت اس کا تیسرا نمبر ہے، اس لحاظ سے اس نسخہ کی اہمیت اظہر من الشمس ہے، اس میں چونتیس [۳۴] ورق ہیں، ہر صفحہ میں تیئیس [۲۳] سطریں ہیں، درمیان سے چند ورق غائب ہیں، ابتدا اور انتہا محفوظ ہے، خط نسخ ہے، لیکن بڑے اہتمام سے اس کی کتابت ہوئی ہے، قصیدے عنوان کے ساتھ ہیں، یہ عنوانات سرخ روشنائی سے لکھے ہوئے ہیں، کتابت کا یہ التزام قابل توجہ ہے کہ ہر دو مصرع کا آخری لفظ سرخ روشنائی میں ہے، اس مجموعہ میں ترپن [۵۳] قصیدے اور دس [۱۰] رباعیاں ہیں، موجودہ حالت میں اشعار تقریباً ڈیڑھ ہزار ہوں گے، شمس طبسی نے زیادہ اشعار نہیں کہے ہیں، رضا قلی خاں ہدایت کے مجمع الفصحاء میں اشعار کی تعداد تقریباً دو ہزار [۲] لکھی ہے، تقی بینش مصحح دیوان شمس طبسی نے جو نسخہ مرتب کیا ہے اس میں دو ہزار دو سو اٹھاسی [۲۲۸۸] اشعار ہیں، اس میں چونسٹھ [۶۴] قصیدے، اکیس [۲۱] قطعے، پانچ [۵] غزلیں اور اٹھائیس [۲۸] رباعیاں ہیں، ان کے علاوہ ان کے تین [۳] قصیدے، تین [۳] قطعے، ایک [۱] غزل، تین [۳] رباعی اور ایک مستزاد کی نسبت مشکوک ہے، البتہ اس بات کا بخوبی امکان ہے کہ اصل نسخہ زیادہ منظومات پر مشتمل تھا، علی گڑھ کے نسخہ میں غائب شدہ اوراق کی تعداد کا قطعی تعین نہ ہو سکنے کی وجہ سے

یہ بات طے نہیں ہو سکتی کہ کتنے مندرجات نسخہ ہٰذا سے الگ ہو چکے ہیں، بہرحال اس میں نہ غزلیں ہیں اور نہ مقطعات، اور ان حصوں کے اصل نسخے میں شامل ہونے کے امکانات بھی کم ہی معلوم ہوتے ہیں، اس نسخے کے سلسلہ میں چند امور نہایت درجہ قابل توجہ ہیں:

(۱) اس کے حاشیہ پر جابجا مختلف مواقع پر اشعار کا اضافہ ہوا ہے، بعض جگہ متعدد صفحات پر پوری کی پوری نظمیں ملتی ہیں، یہ اضافے خاصے پرانے ہیں، ایک جگہ احدی والف سنہ ۱۰۰۱ ہجری درج ہے۔

(۲) رباعی جہاں شروع ہوتی ہے، وہاں ورق یا اوراق غائب ہیں اور اس سے فوراً پہلے جو قصیدہ ہے وہ بھی ناتمام ہے، واضحاً کچھ رباعیاں مفقود ہیں، ممکن ہے ایک آدھ قصیدہ بھی غائب ہو۔

(۳) درمیان میں ص ۲۲ پر ایک قصیدہ شروع ہوتا ہے جس کا مطلع یہ ہے:

اے بختِ پایدار تو دست اماں گشادہ — کلکِ ظفر پیام تو ملکِ جہاں گشادہ

اس کے بعد کا ورق نہیں، اس کی بنا پر یہ قصیدہ ناتمام ملتا ہے اور اس کے فوراً بعد ایک قصیدہ کا یہ شعر ملتا ہے:

بخواہ بادۂ گلگوں کہ در گذرگہ باغ — ز غنچہ زرگر تقدیر جام می تازد

مطبوعہ دیوان ص ۲۴ کے تقابل سے معلوم ہوا کہ اس قصیدہ کے ابتدائی آٹھ شعر غائب ہیں، اس قصیدہ کا مطلع یہ ہے:

صبا ز مہدِ ہوا چوں دمِ مسیحا زد — گل از حجابِ عدم خیمہ سوئے صحرا زد

دوسرے مفقود اشعار یہ ہیں:

ز لالہ چہرۂ صحرا چناں فروغ گرفت — کہ بر سپہر شفق دار عکس صہبا زد

زمانہ از پے آں زد سپید مہرۂ رعد — کہ گل ز تختِ چمن لافِ تختِ دارا زد

جمالِ زہرہ پس پردۂ خجالت ماند — ز بسکہ بلبلِ خوش نغمہ راہ عنقا زد

ہوا نگر کہ ز بس پرتو تجلی برق — چو شعلہ در دل سنگین طور سینا زد

مگر ز غیرت دامن زمانہ آگہ نیست — کہ بر عذار جہاں آبروئے عذرا زد

بگوش بلبلِ آشفتہ دل چہ وعدہ بگفت — کہ روز و شب ز پے آں در تقاضا زد

زہے بتے کہ دلِ آفتاب گوہر دلد — ز عکس روئے تو چوں تیغ زنگ سودا زد

(۴) سنہ کتابت آخری صفحہ پر لفظوں میں سات سو اکیس ہجری درج ہے، کاتب کا نام مٹا ہوا ہے، صرف "الجیلانی" پڑھا جاتا ہے، شروع میں ایک طلائی شمسہ کے اندر "دیوان الدین شمس طبسی" بڑے اہتمام سے درج ہوا ہے۔

(۵) یہ نسخہ گول کنڈہ کے قطب شاہی سلاطین کے کتاب خانے میں رہ چکا ہے، چنانچہ سرورق پر ابراہیم قطب شاہ (سنہ ۹۵۷ھ - ۹۸۸ھ) محمد قلی قطب شاہ (سنہ ۹۸۸ھ - سنہ ۱۰۲۰ھ) اور محمد قطب شاہ (سنہ ۱۰۲۰ھ - سنہ ۱۰۳۵ھ) تینوں بادشاہوں کی مہریں ثبت ہیں، اوپر ابراہیم قطب شاہ کی مہر ہے، جس کا سجع یہ ہے:

شہے کہ نقش نگیں ساخت مہر آل مقیم — بود بہ سپہر کرم قطب شاہ ابراہیم

اس کے نیچے ایک بڑی مہر محمد قلی قطب شاہ کی ہے، اس کا سجع حسب ذیل ہے:

ملک جہاں مرا کہ بزیر نگیں شدہ — از حکم بادشاہ جہاں آفریں شدہ

تیسری مہر کا سجع پڑھا نہیں جا سکا ہے۔

(۶) اس مجموعہ کے ابتدائی اٹھائیس[۲۸] قصیدے اسی ترتیب سے ہیں، جیسا کہ انڈیا آفس کے نسخے کے ہیں، یہ نسخہ سنہ ۱۳ھ کا ہے اور صحت متن کے لحاظ سے بقول تقی بینش نہایت قابل توجہ ہے،

دونوں نسخوں کی ترتیب کی یکسانی سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اصل نسخے کی ترتیب اسی طرح رہی ہوگی،
ان دونوں نسخوں میں ابتدائی قصیدے کا مطلع یہ ہے:

ہر دل کہ سوئے عرصہ تحقیق راہ یافت
در سایۂ سرادق عزت پناہ یافت

یہ قصیدہ مدح باری تعالیٰ میں ہے، اس بنا پر اصل دیوان میں اس کا سب سے پہلا قصیدہ ہونا مسلم ہے، یہی قصیدہ جاجرمی نے منجملہ اور قصیدہ کے "توحید" کے ذیل میں نقل کیا ہے۔

(۷) اس دیوان میں مندرجہ حسب ذیل تین قصیدے کسی اور نسخے میں نہیں پائے جاتے:

اے برق ہنر پاے گہر لمعۂ شہابی
یا عکس نور گستر شمشیر آفتابی

(ورق ۹۱ ۸)

یہ قصیدہ صدر الدین محمد نظام الملک کی مدح میں ہے، جس کے لیے شمس طبسی نے متعدد قصیدے لکھے ہیں، چنانچہ اس قصیدہ کے متصل پہلے والا قصیدہ:

زلف تو شد کمیں گہ آشوب روزگار

بھی اسی ممدوح کی مدح میں ہے:

اے بخت پایدار تو دست اماں گشادہ
کلک ظفر نیام تو ملک جہاں گشادہ

اس قصیدے کے آخری ابیات ورق گم ہو جانے کی بنا پر مفقود ہیں، تیسرا قصیدہ رباعی کے فوراً پہلے ہے، لیکن کرم خوردہ ہونے کی وجہ سے پڑھا نہیں جاسکا، اس کے چند ہی اشعار ہیں، مطلع کے یہ الفاظ پڑھے جاسکے ہیں:

اے زیر آسمانی ... ... (ورق ۳۴ ب)

(۸) اس مجموعہ میں صرف دس رباعیاں ہیں، ان میں سے کوئی کسی نسخے میں شامل نہیں، یہ نسخے کا آخری ورق ہے، اس پر کاغذ چسپاں ہے، اس سے اس کے پڑھنے میں خاصی دقت اٹھانی

پڑی ہے، آخری دو رباعیاں بالکل نہیں پڑھی جاسکی ہیں، جتنا کچھ پڑھی جاسکی ہیں، وہ ذیل میں درج ہیں:

ایں خط کہ رخ ترا ہمی آراید
طوطی ست کہ بر بوئے شکر می آید
گر دل بری شکر فروشی شاید
زاں پیش کہ طوطی شکرت می باید

از عشق تو در تنم رواں می سوزد
شرحش چہ دہم کہ بر چہ ساں می سوزد
از دل ..... چہ کنم رگِ جاں می گسلد
وز گریہ چو شمع دل و جاں می سوزد

گر یار بہ اندکی کہ اندر دل چیست
یا گفت .... کی دلدارم چیست
بوذی کی ..... دل نیائستی مرد
بوذی کہ بکام دل بشائستی زیست

کو دل کہ خون جگر آرم با او
یا صبر کہ روزے بسر آرم با او
کو شیفتہ و تیرہ روزے چوں من
تا در غم او دمے بر آرم با او

دوش از غم تو ... دیدہ بہم نزدم
ور زانک زدم بدانک دم نزدم
زا ..... کہ دم ... کند آتش دل
یا روز ہمی سوختم و دم نزدم

اے چشم من از سراب سیم آ . لی
وے اشکِ من از پستہ تو عنابی
در نرگس چشم تو عجب می مانم
کو تازہ چگونست بدیں بے خوابی

... ... از ملک جہاں می خواہی
طغیانی اشک من ببیں و دور مشو
گر سبزہ و گر آب رواں می خواہی

چہ گگ مر مردہ مگیر (؟)
از مردکانت خردہ بر مردہ مگیر
بر کنارت طبقی زر دارد (؟)
بے خرد کی ار چہ کند خردہ مگیر

مجموعۂ کلام شمس طبسی کا یہ نسخہ املائی اعتبار سے قابل توجہ ہے، اس کی حسب ذیل خصوصیات ہیں:

(۱) دال اور ذال کا فرق ملحوظ رکھا گیا ہے، جیسے بود کے بجائے بوذ، شود کے بجائے شوذ

بدیں کے بجائے بذیں، دادہ کے بجائے داذہ، دیدم کے بجائے دیذم، امید کے بجائے امیذ،
شد کے بجائے شذ، نماید کے بجائے نمایذ وغیرہ۔

(۲) حرف کاف بیاں 'ک' کے بجائے 'کی' جیسے یہ بیت ملاحظہ ہو:

بچرخ سرزدہ گفتم کی شکل شمس نیابی — جواب داد کی ہستی دریں حدیث صدق

(۳) حرف کاف صلہ 'کہ' جدید شکل میں ملتا ہے، جیسے:

بے گرد موکب تو کہ اکسیر دولت است

اور کبھی 'کی' کی شکل میں، جیسے:

شمشیر یل کی طوطی ہندی نژاد فتح

(۴) حرف کاف علت 'کہ' کی صورت میں، جیسے:

انصاف دہ کہ تا بلۂ مہربان بخت الخ

(۵) حرف اضافہ 'بہ' متصل ملتا ہے جیسے بگوش، اسی طرح 'نہ' جو فعل منفی کی علامت ہے، متصل آتا ہے جیسے نیابی۔

(۶) 'می' جو علامت استمرار ہے، کبھی پیوست اور کبھی جدا ملتی ہے، 'است' دوسرے جزے پیوست آتا ہے، جیسے دولتست، کششت۔

(۷) ہمزہ کے استعمال کی یہ صورتیں ہیں:

(ا) یائے خطاب، جیسے نۂ سحاب، یعنی سحاب نیستی۔

(ب) ہمزۂ اضافت، ایسے الفاظ میں جو ہائے مختفی پر ختم ہوتے ہیں، جیسے:

چوں چہرۂ تو قاعدۂ روز برگرفت

خیمۂ ازرق، دیدۂ تر۔

(یہ بات قابل توجہ ہے کہ ہائے ملفوظہ میں ہمزہ کا استعمال نہیں ہے، جیسے کنہ ریاضی)

(ج) واو عطف پر جیسے: چرخ ؤ مدار فلک

(د) ایسے تمام الفاظ خواہ فارسی کے ہوں یا عربی کے، اگر الف پر ختم ہوتے ہیں تو اس میں اکثر و بیشتر اضافت رہے، جیسے ہواءِ سینہ، سلطاء۔

(ہ) یائے تنکیر کی صورت میں جیسے

دیدۂ تر دامنم گشتست دریائی کزو

(اکثر ایسے الفاظ جو 'ی' پر ختم ہوتے ہیں، اضافت کی صورت میں نہ ان کے اوپر ہمزہ ہے اور نہ نیچے زیر جیسے طوطی ہندی نژاد)

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ طاؤس جیسے لفظ محض ایک واو سے ملتے ہیں، اور وہ بھی بدون ہمزہ اسی طرح رای، سوی، روی، موی بغیر ہمزہ آئے ہیں۔

(۸) 'ی' کے املا میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس نسخہ میں عام رواج کے برخلاف اس کے نیچے دو نقطے نہیں ملتے، جیسے طوطی، ہندی میں نقطے نہیں ہیں۔

(۹) گ، پ، چ، کاف، بے اور جیم سے ظاہر کیے گئے ہیں، لیکن ژ پر تین نقطے ہیں، ش، ث پر تینوں نقطے ہیں، 'س' سادہ ہے، اس کے نیچے تین نقطے جو بعد میں بہت ملتے ہیں نہیں ہیں۔

(۱۰) مد اور تشدید کا اکثر التزام ملتا ہے۔

دیوان کے اس اہم نسخے کے انکشاف سے کئی فوائد متصور ہیں۔

اول یہ کہ کم از کم تین قصیدے (ایک مکمل اور دو نامکمل) اور دس رباعیاں اس نسخے کی بدولت ایک ایسے شاعر کی دستیاب ہوئی ہیں جس کا کلام دو ہزار ابیات سے کچھ ہی زائد ہے، یہ

نہ بھولنا چاہیے کہ یہ درجہ اول کا شاعر ہے، جس کا تذکرہ فارسی کے اکثر تذکرے اور تاریخ کی کتابوں میں ملتا ہے، اور جس کے کلام کا انتخاب اہم بیاضوں کی زینت ہے۔

دوم یہ کہ اس شاعر کے کلام کا ایک ناقدانہ متن تیار ہوا ہے، علی گڑھ کے نسخے کی مدد سے اس کے متن میں خاطر خواہ اضافہ ہو سکتا ہے، ضمناً عرض ہے کہ تقی بینش نے ایک قصیدہ کو جس کا مطلع یہ ہے:

دوش در موکب سیاہ ظلام — خوارشد خسرو ولایت شام

کا انتساب شمس کی طرف مشکوک قرار دیا ہے (دیکھیے ص ۱۱۹ - ۱۲۰) اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ قصیدہ محض ایک نسخہ میں جس کی کتابت ۱۲۵۸ھ ہے، شامل ہے، لیکن یہ قصیدہ ہمارے پیش نظر نسخے میں موجود ہے، اس بنا پر اس کا انتساب شبہہ سے پاک ہے، اور یہ یقیناً شمس طبسی کا اپنا قصیدہ ہے، یہ قصیدہ صدر الدین محمد نظام الملک کی مدح میں ہے، جس کی تعریف میں طبسی کے چند اور قصائد دیوان میں موجود ہیں۔

تیسرے یہ کہ فارسی کے قدیم قلمی نسخوں میں ایک اور قابل ذکر نسخے کا اضافہ ہوا ہے۔

چوتھے یہ کہ مسلم یونیورسٹی کے کتاب خانے میں فارسی کے چند قدیم ترین نسخوں میں اس کا شمار ہے، دیوان شمس طبسی کے دو اہم نسخوں کا حال معلوم ہو سکا ہے، لیکن یہ دونوں نسخے مختلف شعراء کے مجموعہ میں شامل ہیں، بخلاف علی گڑھ کے نسخے کے کہ یہ کسی مجموعہ میں شامل نہیں، بلکہ الگ نسخہ ہے، ان دونوں نسخوں میں پہلا چیسٹر بیٹی ڈبلن کے ذخیرہ میں ہے، اس نسخہ میں حسب ذیل دس شاعروں کا کلام شامل ہے، ان میں کمال اسمٰعیل، عبد الواسع جبلی، رشید وطواط، ابو الفرج رونی، ازرقی شمس طبسی، نجیب جربادقانی، رفیع لنبانی، امامی ہروی اور انوری ہیں۔

مجموعہ کی کتابت کی تاریخ ۲۳ ذی الحجہ ۶۹۹ھ ہے، جو نسخہ میں کئی جگہ مذکور ہے، شمس طبسی کا کلام گیارہ اوراق پر مشتمل ہے، لیکن اس کے ابتدائی آٹھ ورق غائب ہیں، یہ نسخہ مصور ہے، اس کے مندرجات کی تفصیل دیوان شمس طبسی تصحیح تقی بینش تعلیقات ص ۱۴۳ تا ۱۴۵ مندرج ہے۔

دوسرا نسخہ انڈیا آفس لندن کا ہے، یہ ۱۳ ۷ھ کا ہے، کاتب کا نام عبد المومن علوی کاشی ہے، یہ نسخہ بھی ایک مجموعہ میں شامل ہے جس میں حسب ذیل چھ شاعروں کے دیوان کا انتخاب پایا جاتا ہے: امیر معزی، اثیر اخسیکتی، ادیب صابر، نظام الدین محمود قمر اصفہانی، شمس طبسی، ناصر خسرو۔ یہ نسخہ مصور ہے، اس میں شمس طبسی کے کم و بیش دو ہزار اشعار ہیں، تقی بینش کے انتقادی متن میں شمس طبسی کے دیوان کا یہ حصہ جو اس مجموعہ میں شامل ہے، بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

ان دونوں نسخوں کی اس قدر تفصیل سے اندازہ ہو سکے گا کہ علی گڑھ کا نسخہ نہایت اہم ہے، اور شمس طبسی کے کلام کی اشاعت میں اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔

اسلام اور مستشرقین

پر

دار المصنفین کا بین الاقوامی سیمینار

از سید صباح الدین عبد الرحمٰن

(۴)

۲۲ فروری ۸۲ء کی صبح کی نشست کی صدارت ندوۃ المصنفین کے صدر جناب مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی نے کی اور اس کی کارروائی کو آگے بڑھانے کے فرائض ڈاکٹر سید سلمان ندوی نے انجام دیئے سب سے پہلے اس نشست میں ڈاکٹر عبد العظیم الدیب قطر یونیورسٹی نے اپنا مقالہ المستشرقون والتاریخ کے عنوان سے پیش کیا، اس کا اردو خلاصہ جناب مولوی محمد رضوان ندوی استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء نے پیش کیا، جس سے ان کی علمی صلاحیت کا بھی اندازہ ہوا۔

ڈاکٹر عبد العظیم الدیب ڈاکٹر عبد العظیم الدیب نے فرمایا کہ ندوہ اور اس کے فارغین نے مستشرقین کے افکار کے متعلق اس وقت کام شروع کیا، جب کہ دنیا میں افکار و نظریات کی ایک کشمکش تھی استشراق کی تحریک میں تطور ہے، مستشرقین نے پہلے تو علوم اسلامیہ کو اپنی زبان میں منتقل کیا، اور ان کی نشر و اشاعت بھی کی، لیکن بعد میں ان کا نقطۂ نظر بدل گیا، انھوں نے ایسی کتابوں کی نشر و اشاعت کی جو اسلام اور مسلمانوں کے لیے مضر تھیں، ان کی وجہ سے مسلمانوں کی نئی نسل میں غلط خیالات پھیلے، تحریک استشراق ایک طرح سے مسلمانوں کو ان کے ماضی سے متنفر کرنے کے مترادف ہے، بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ استشراق ایک علمی تحریک ہے، مگر یہ امر واقعہ نہیں اس کے اصل مقاصد اور ہیں جن کے

تحت یہ تحریک کام کر رہی ہے، مستشرقین پر صرف الزام تراشی کافی نہیں، بلکہ ان کے زہر کا تریاق پیش کرنے کی ضرورت ہے، ہمیں اس بات سے خوشی ہے کہ دار المصنفین کی خدمات اس لحاظ سے نہایت قابل قدر ہیں کہ اس نے اسلامی تاریخ کو زیادہ سے زیادہ معتبر بنا کر لکھوایا اور طبع کیا، مستشرقین کا خاص نشانہ اسلامی تاریخ ہی ہے جس کو انھوں نے محرف اور مسخ کرنے کی دانستہ کوشش کی، اسلامی تاریخ کے غیر اہم واقعات کو اہم بنا دیا اور اہم واقعات میں برے پہلو دکھائے، اسلامی تاریخ کے بہت سے ایسے واقعات ہیں جن کی واقعیت اور حقیقت میں کلام ہے، لیکن مستشرقین کے نزدیک انہی کی اہمیت ہے، اسلام اور مسلمان مخالف تحریکوں کو انھوں نے مرکزی حیثیت دے دی، اسلامی تاریخ میں جو فتنے اٹھتے رہے وہ ان کی نظر کو بھائے اور انہی کو اہمیت دے کر مسلمانوں کو اصلی اسلامی فکر سے دور کرنے کی کوشش کی، اب ضرورت اس بات کی ہے کہ مستشرقین کی کتابوں میں جو غلطیاں ہیں وہ سامنے لائی جائیں، پھر اسکول اور کالج کے طلبہ کے لیے معیاری کتابیں اس طرح لکھی جائیں کہ ان کی عمر کے لحاظ سے تاریخی واقعات تو دیانت داری کے ساتھ پیش کیے جائیں لیکن دین کی خیر خواہی بھی ملحوظ رکھی جائے، تاکہ مسلمان طلبہ کے ذہن کی صحیح تربیت ہو، مثلاً واقعۂ جمل اور واقعۂ تحکیم کو اس طرح نہ لکھا جائے کہ اس کا تہائی حصہ تو ان واقعات کے لیے صرف کیا جائے جس میں صرف انتشار اور ہنگامے رہیں، اور دوسرا تہائی حصہ بھی اسی انتشار پر رائے زنی سے متعلق ہو، اگر ایسا کیا گیا تو دو تہائی حصہ ذہن میں صرف الجھن پیدا کرنے والا ہوگا، یہ تو مناسب نہیں کہ تاریخی واقعات لکھنے میں اختراع سے کام لیا جائے، لیکن اس کا لحاظ ضرور رکھا جائے کہ مستشرقین بڑی چابکدستی بلکہ سبک دستی سے واقعات کا انتخاب اس طرح کرتے ہیں کہ پڑھنے والوں کو وہ نہایت سیاہ اور تاریک نظر آئیں، ایسے ادارہ کے لیے جہاں تاریخ نویسی کا کام ہو رہا ہے، ان تمام باتوں کو سامنے رکھ کر ہر سطح کے معیار کے مطابق معتبر تاریخ لکھ کر پیش کی جائے۔

جب یہ مقالہ ختم ہوا تو ڈاکٹر سید سلمان ندوی نے اعلان کیا کہ جناب عبدالکریم سا تو صاحب جاپان سے آگئے ہیں، وہ مکہ مکرمہ کی مسجد کونسل کے ممبر ہیں، اور جاپان میں اسلام کے بہت بڑے داعی اور مبلغ ہیں، وہ اس مجلس میں تشریف فرما ہیں، ان کو مولانا ابوالحسن علی ندوی کی کرسی کے بغل میں اسٹیج پر جگہ دی گئی۔

پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی

دوسرا مقالہ جامعہ ملیہ کے پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی کا مشہور مستشرق مسٹر ہملٹن گب پر تھا، ان کا پورا مقالہ تو معارف کی کسی آیندہ اشاعت میں شائع ہوگا لیکن اس میں سے وہ اس نشست میں جو کچھ پڑھ چکے اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے،

پروفیسر صاحب نے فرمایا: مشرق کے مذاہب اور ان کے تہذیب و تمدن کے مطالعہ کیلئے مستشرقین نے جو کوششیں کی ہیں، ان کے مقام و مرتبہ کا ہمیں احساس ہے، اس میدان میں ان کی کاوشوں نے استشراق کو علم کا ایک ممتاز، عظیم، اور وسیع شعبہ یعنی ایک مخصوص ڈسپلن بنادیا، مستشرقین نے علم کے ایک بڑے خزینہ کو جو وقت کے دبیز دھندلکوں میں دفن تھا، نکالا، نادر و نایاب کتابوں کا پتہ چلایا، انھیں حاصل کرکے ان کا مطالعہ کیا اور ان میں بہت سی نادر کتابوں کو ایڈٹ کرکے نہایت اہتمام سے شایع کیا، ان پر حواشی لکھے اور بعض کی شرحیں بھی کیں، مختلف زبانوں میں ان کے ترجمے شایع کیے جن سے مشرق و مغرب کے علماء و محققین نے استفادہ کیا، انھوں نے تحقیق و تنقید کے ارتقار پذیر اصولوں اور طریقوں کی مدد سے اپنے تحقیقی کام کو علمی مقاصد کی خاطر باوقار بنانے کی کوشش کی، اس کے علاوہ تہذیبوں اور مذہبوں کے مطالعہ میں انھوں نے دوسرے علوم مثلاً لسانیات، علم الالسنہ، فلسفہ، تاریخ اور سماجی علوم سے بھی مدد لی، اس طرح علم الاستشراق کو انتر ڈسلپنری علم بھی بنادیا، ہمیں ایسے مستشرقین کی علمی خدمات کا اعتراف ہے، لیکن ہمیں افسوس ہے کہ ان کے علمی کارناموں میں جو کسی لحاظ سے قابل قدر ہیں سب سے بڑی

کمزوری ان کی موضوعیت اور داخلیت ہے، انھوں نے دعوی تو کیا معروضی مطالعہ کا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ کوئی ایسا نہیں جو اپنے ذہنی تحفظات اور مذہبی تعصبات سے دامن بچا سکا ہو، خاص طور سے اسلام، قرآن، پیغمبر اسلامؐ اور قانون اسلام سے متعلق ان کا مطالعہ غیر معروضی ہی نہیں، بلکہ اکثر مستشرقین کے یہاں ان کا تعصب صاف طور پر نمایاں ہے، مستشرقین میں ایک تعداد یہودیوں کی ہے، مگر بڑی تعداد عیسائیوں کی ہے، اس کے سیاسی اور تاریخی اسباب ہیں، یہ لوگ اسلام اور پیغمبر اسلام سے نفرت اور تعصب کی جن روایات کے وارث ہیں، اس کی داستان صدیوں پرانی ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ یہ داستان چودہ سو برس پر پھیلی ہوئی ہے، اس میں کئی اتار چڑھاؤ ہیں، اس کے کردار بدلتے رہے ہیں، اس کے پلاٹ میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں لیکن داستان کا بنیادی نقطہ ایک اور صرف ایک رہا ہے، بیسویں صدی کے تیسرے دہے، اور خاص طور پر دوسری جنگ عظیم کے بعد مستشرقین کے رویہ میں بھی تبدیلی ہوئی ہے، اس تبدیلی کے سیاسی اور معاشی اسباب ہیں، لیکن اس زمانہ میں علم الاستشراق کا انحطاط علمی اعتبار سے ہوا اور اب مستشرقین میں ایسے عالم نہیں ملتے جیسے کہ انیسویں اور بیسویں صدی کے اوائل میں تھے، بس ایک سنجیدہ اور بردبار مستشرق نظر آتا ہے جس کا علم بھی گہرا ہے اور نظر بھی دقیق ہے مگر وہ بھی کلی طور پر غیر جانبدار نہیں ہے، اس کی بعض تحریروں میں اس کے نظریات اور خیالات کی جھلک دکھائی دیتی ہے جو اسے اپنے پیش روؤں سے ورثہ میں ملے ہیں، ہماری مراد سر ہملٹن گب سے ہے، علمی دنیا نے گب کے علمی کارناموں کا خوب خوب اعتراف کیا، کئی اعزاز بھی ان کو ملے، کئی علمی اور ادبی سوسائٹیوں کے ممبر بھی رہے، ان کے مضامین کی فہرست بھی خاصی طویل ہے، مغرب میں ان کے عقیدت مندوں نے انھیں صف اول کے اسلامی اسکالرس میں شمار کیا ہے، مسلمان بھی ان کی محققانہ بصیرت اور مورخانہ ژرف نگاہی کے قائل ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی کتابیں

ان کے وسیع مطالعہ، تشریح کی غیر معمولی صلاحیت، فکر کی شادابی اور گہری بصیرت کی شاہد ہیں، انھوں نے جدید عربی کے ارتقا پر بھی مضامین لکھے جس میں اس زبان وادب کے جدید رجحانات پر سیر حاصل بحث کی ہے، وہ اپنے معاصر مستشرقین کے مقابلہ میں عربی زبان وادب سے کہیں زیادہ واقف تھے، بلکہ اس سے گہرا تعلق بھی رکھتے تھے، ان کے ایک مضمون اسلامک بایوگرافی کل لٹریچر سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام اور تاریخ اسلام کے مطالعہ میں عربی ادب کے وسیع مطالعہ کو کتنی اہمیت دیتے تھے، وہ عربی ادب کے شیدائیوں میں تھے، ابن خلدون کا چالیس برس تک مطالعہ کیا اور اسی سے علم وآگہی اور مسرت وانبساط حاصل کرتے رہے، اس کے ادبی محاسن کا ذکر انھوں نے کچھ اس طرح کیا ہے کہ ان کی نظر میں ابن خلدون اپنے تخیل کے ساتھ ایک حیات آفریں، رنگین اور رعنا شخصیت کے مالک ہیں، وہ اس کی تحریروں کو معنوی لذت سے پھیکا قرار دیتے ہیں، مگر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کی طلاقت لسانی سے فراوانی کا احساس ہوتا ہے، اس کے خیالات آبشار کی طرح گرتے نظر آتے ہیں، کبھی یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے پرجوش بے ربطی کے ساتھ نیم ظلمتوں میں کھو جاتا ہے، لیکن وہ اپنی خوش وضع اور خوش آہنگ نثر میں اس کی بڑی قدرت ظاہر ہوتی ہے، وہ جملوں کی تراکیب، فقروں کی ترتیب، چست ونفیس تنظیم اس کے قابو میں رہتی ہے، وہ اپنے خیالات کا اظہار ایسی تربیت یافتہ شائستگی ولطافت سے کرتا ہے کہ اس کی تحریر کی معنویت اس کے دلائل کے تابع ہو جاتی ہے، اس کا خاص میدان تاریخ و تمدن ہے، ان دونوں کے ارتقا و نشوونما میں زبان وادب کے رول کی اہمیت سے وہ اچھی طرح واقف ہے، تاریخ وتمدن کے موضوعات پر گب کے کچھ اپنے نظریات تھے، اسی لیے واقعات کو اپنے انہی نظریوں کی روشنی میں دیکھتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ عربوں کی قبائل کی مخالفت فوجی طاقت کے ذریعہ سے دبا دینے سے کوئی مناسب اور مستقل حل حاصل نہیں ہو سکتا تھا، اس لیے ضروری تھا کہ ایسے حالات پیدا کیے جائیں کہ عرب کے قبائل اگر اسلام میں پورے طور سے داخل نہ ہوں تو کم از کم اسلام کے جزوی مفاد سے

اپنے آپ کو وابستہ کرلیں، یہی وجہ ہے کہ حضرت محمد صلعم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی نے سوچی سمجھی اسکیم کے ماتحت مکی سرداروں کی قیادت میں قبائل کو شام کی سرحدوں پر حملے کے لیے بھیجا، مقصد یہ تھا کہ قبائل کا رخ دوسرے ملکوں کی طرف پھیر دیا جائے، اس میں کامیابی ہوئی، اور فتوحات کا سلسلہ شروع ہوگیا، گب اس طرح یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ بدوی قبائل نے اسلام کو انسانی، اخلاقی و روحانی اصولوں کی بنا پر نہیں اپنایا بلکہ جب انھوں نے دیکھا کہ اس سے ان کا دنیوی ومادی مفاد وابستہ ہے تو اسلام سے ان کا تعلق پیدا ہوگیا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے گب نے اپنے ذہن میں ایک کلیہ قائم کیا اور شام وعراق کی اسلامی فتوحات کو اسی کلیہ سے دیکھنے کی کوشش کی، ہمارے نزدیک یہ رویہ تاریخ نگاری کے جدید اصولوں کے مطابق نہیں ہے، اس سے تحقیق کی معروضیت کا وقار مجروح ہوتا ہے، جس پر یورپ کے جدید محققین ناز کرتے ہیں، یہی رویہ گب کا علم حدیث کے بارے میں ہے، وہ اپنے ایک مضمون میں اپنے حسن بیان اور مخصوص طرز استدلال سے مسحور کرکے یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ پہلی صدی ہجری کے ختم ہوتے ہوتے چونکہ اسلامی قوانین اور ان کے نفاذ کا مسئلہ بڑا پیچیدہ ہوگیا تھا، خلافت کے مختلف شہروں اور صوبوں میں مقامی علماء اپنی اپنی فہم کے مطابق آزادانہ رائے دیتے تھے جو بسا اوقات باہم مختلف اور متضاد ہوتی تھی، اس تضاد سے پیدا ہونے والی پیچیدگیوں کو علماء نے خطرناک تصور کیا، اس مسئلہ کا انھوں نے یہ حل ڈھونڈا کہ پیغمبر اسلام کے معاصرین کے واسطے سے احادیث بیان کرنا شروع کردیں جن میں واضح مسائل سے متعلق روایتیں حضرت محمدؐ سے منسوب ہوتی تھیں، ان کی پابندی کو ضروری قرار دیا، اور ان کی حیثیت آیات قرآنی سے کمتر نہیں سمجھی گئی، اور جب گب حدیث اور تدوین حدیث کا ذکر کرتے ہیں تو اس کو علماء کی مصنوعی تخلیق سے تعبیر کرتے ہیں، اس طرح وہ حدیث کی اہمیت کو اپنے مسلمان قارئین کی نظر میں کم کرنا چاہتے ہیں اور یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ پروفیسر گب کو

سلطان صلاح الدین ایوبی کی شخصیت سے گہرا شغف ہے، انھوں نے بارھویں صدی کی اس پرکشش
اور غیر معمولی شخصیت کا گہرا مطالعہ کیا ہے، اور ان پر جو مضامین لکھے وہ جدید طرز کی تحقیق کے اعلیٰ
نمونے ہیں، ان کے خیال میں سلطان صلاح الدین ایوبی ایسی شخصیتوں میں نہیں تھے جو محض اپنے
گرد و پیش کے حالات کی پروردہ ہوتی ہیں، بلکہ خود ایک بڑے مقصد کے لیے اپنے دینی اخلاق
کے سہارے نہ صرف حالات کو اپنے موافق بنایا، بلکہ نئے حالات بھی پیدا کیے اور سیاسی انحطاط
اور اخلاقی زوال کے اس عہد میں اسلام اور مسلمانوں کی آبرو باقی رکھی، پروفیسر گب نے لکھا ہے کہ
اس عہد کی تاریخ میں شاذ و نادر ہی ایسے مستند ماخذ ملتے ہیں جن کی مدد سے صحیح اور مثبت نتیجے نکالے
جا سکیں، اور جو تاریخ و تنقید کے سخت سے سخت معیار پر کھرے ثابت ہوں، لیکن سلطان صلاح الدین
کی زندگی سے متعلق خوش قسمتی سے عربی زبان میں اسی زمانہ کے پانچ مراجع دستیاب ہیں، گب نے ان پانچوں
کتابوں کو ہر پہلو سے جانچا ہے اور ان کی خوبیوں اور کمزوریوں کو تحقیق کے اعلیٰ معیار کے مطابق پرکھا
ہے، وہ ان سے استفادہ کرتے ہوئے اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ پہلی بار دیکھنے میں آیا کہ ایک مسلم
حکمراں مسلسل تین۳ سال تک میدان جنگ میں اپنی افواج کے ساتھ اپنے مستعد دشمن کے مقابلہ میں
ڈٹا رہا، جبکہ اس عہد کا فوجی نظام ایسی طویل جنگ کا مشکل ہی متحمل ہو سکتا تھا، ان کے خیال میں
یہ صورت صرف اس لیے ممکن ہو سکی کہ باوجود اس کے کہ سلطان صلاح الدین کوئی ماہر جنگ یا تجربہ کار
حکمراں نہ تھے، پھر بھی ان کی ایک ایسی شخصیت تھی جو صلیبی حملہ آوروں کے خلاف مسلمانوں کے
مختلف النوع عناصر اور باہم متحارب سیاسی قوتوں کو اتحاد اسلامی کے لیے ایک مرکز پر متحد اور
مجتمع کر سکتی تھی، ہمت و شجاعت اور صبر و استقامت، ان سب اخلاقی خوبیوں سے وہ متصف
تھے اور یہ سب ان کے کام بھی آئیں، لیکن ان کامیابیوں میں سب سے زیادہ اس بات کو دخل
تھا کہ ان میں بے غرضی و بے لوثی، سخاوت و فیاضی اور اخلاق اسلامی کا احساس برتری ایسا تھا

جنھیں انھوں نے دوست و دشمن سبھی کے ساتھ یکساں برتا، وہ سادہ لوح نہ تھے، لیکن ان میں
غضب کا انکسار اور سادگی تھی، ان کی ایمانداری بے داغ تھی اور بلور جیسی چمک رکھتی تھی،
ان کے دشمن اس بات پر حیران تھے کہ سیاست اور جنگ دونوں میں ان کے عزائم اور طور طریقے
کیوں مختلف ہوتے ہیں، وہ مکر و فریب سے کوسوں دور تھے اور دوسروں کے مکر و فریب کو بھی
شاذ ہی سمجھ پاتے تھے، ان کے اسلامی اخلاق نے انھیں معاہدوں کا احترام کرنا سکھایا، وہ
ہر قیمت پر معاہدوں کی پابندی کرتے تھے اور معاہدہ توڑنے والے دشمن کو ہمہ وقت یہ خیال
رہتا تھا کہ اسے عہد شکنی کی بھاری قیمت ادا کرنی ہوگی، ہمارا خیال ہے کہ شاید کسی عیسائی مورخ
یا سوانح نگار نے مستند ماخذوں کی اچھی طرح چھان بین کرنے کے بعد اور تاریخ و تنقید کے
سارے اصولوں کو برت کر سلطان صلاح الدین کی ایسی خوبصورت اور سچی تصویر پیش کی ہوگی
جیسی گب نے کی ہے، لیکن تاریخ و ادب سے ہٹ کر جب گب قرآن پاک و سیرت رسول ﷺ کے
موضوعات پر لکھتے ہیں تو اکثر مقامات پر اپنی تاریخی بصیرت اور علمی معروضیت سے بے وفائی
کرتے نظر آتے ہیں، ان کے اس رویہ کی توجیہ اور کیا کی جا سکتی ہے کہ ان کے مذہبی عقائد اور
تعصب و جانبداری کی وہ روایت جو ان کو اپنے علمی ماحول اور ورثہ میں اپنے پیش روؤں سے
ملی تھی، ان کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہے، قبل اس کے کہ دو تین مثالوں سے ہم اپنے اس
خیال کی وضاحت کریں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان کے کچھ اقوال یہاں نقل کریں، وہ لکھتے
ہیں کہ ان استعاروں میں سے جہاں عیسائی عقیدہ روایتی طور سے محفوظ ہے، ذہنی طور پر میری تشفی
ہو جاتی ہے، کیونکہ یہ استعارے اور علامتیں روحانی صداقتوں کی ان بلند ترین عظمتوں کی ترجمان
ہیں، جہاں تک میرے فہم کی رسائی ہے بشرطیکہ ان علامتوں اور استعاروں کی تشریح ایسی زبان میں
کی جائے جس میں کسی تجسیمی اور تشبیہی عقیدہ کا اظہار نہ ہوتا ہو، بلکہ ایسے عمومی تصورات ہیں ان کا

بیان ہو جو کائنات کے متعلق ہمارے بدلتے ہوئے نظریوں سے مطابقت رکھتے ہوں قطع نظر اس کے کہ گب کے اس قول کا حقیقی مآلہٗ و ما علیہ کیا ہے، اتنی بات صاف ہے کہ وہ اپنی نظر میں پکے عیسائی تھے، اور ہمارے نزدیک انھیں اس کا حق تھا کہ جس عقیدہ سے انھیں ذہنی و روحانی تسکین حاصل تھی اسے وہ اپنائیں، مگر اس بات کی خوشی ہے کہ وہ مسلمانوں کو بھی اس کا حق دیتے ہیں اسی لیے ان سے توقع کی جاتی تھی کہ مسلمانوں کے عقائد اور حضورؐ کی سیرت اقدس پر لکھتے ہوئے انصاف سے کام لیں گے، ہمارا خیال ہے کہ اس سلسلہ میں ان کی عیسائیت "تاریخی معروضیت اور مذاہب کے تقابلی مطالعہ کی اس بنیادی خصوصیت پر غالب آگئی ہے جسے آج سے صدیوں پہلے ایک مسلمان دانشور اور عالم البیرونی نے الآثار الباقیہ اور کتاب الہند کے سلسلہ میں اپنایا تھا، دوسروں کے مذہبی عقائد و مذہبی روایت کے موضوع پر لکھنے کی آزادی ہے، کسی ایک خاص مذہب کا پیرو دوسرے مذہب کا مطالعہ کر کے اپنے نتائج کو قلمبند کر سکتا ہے، لیکن اس سلسلہ میں تصنیف و تالیف کا اولین اور بنیادی اصول یہ ہونا چاہیے کہ پہلے زیر مطالعہ مذہب کے ماننے والوں کے عقائد پوری وضاحت کے ساتھ اس طرح بیان کر دیے جائیں کہ شکایت کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے کہ ان کے عقائد کو غلط طور پر یا توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا، اب اگر لکھنے والا کسی اور عقیدہ یا نظریہ کا حامل ہے، یا اپنے نظریہ یا کسی اور کے نظریہ کا ذکر کرنا چاہتا ہے تو اس کو اس کا حق حاصل ہے، لیکن اسے چاہیے کہ وہ اپنے یا کسی دوسرے کے نظریہ کو الگ سے اور پوری وضاحت سے پیش کرے، افسوس ہے کہ مستشرقین قرآن پاک اور سیرت رسول پر لکھتے ہوئے اس بنیادی اصول کو عموماً فراموش کر دیتے ہیں، اور کچھ اس طرح کا خلط مبحث کرتے ہیں کہ صرف وہی لوگ جن کا اسلام کا مطالعہ اچھا ہے، یہ محسوس کر سکتے ہیں کہ لکھنے والا اپنے ذاتی خیال و عقیدت کو اپنے قاریوں کے ذہن میں بٹھا دینا چاہتا ہے، حیرت یہ ہے کہ پروفیسر گب جیسے بالغ نظر مصنف بھی جس کی علمیت و متانت کے

بہت سے مسلمان بھی معترف ہیں، اپنا دامن، اس عیب سے پاک نہ رکھ سکے، پروفیسر گب نے اسلام پر جو کتابیں لکھی ہیں، ان میں سے ایک کا نام محمڈن ازم ہے، مارگولیتھ نے اسی نام سے ۱۹۱۱ء میں ایک کتاب لکھی تھی، پروفیسر گب نے اس خیال سے کہ بقول ان کے ۱۹۱۱ء کی علمی فضا اور تھی، نظریے اور تھے، جذبات اور تھے، اور چونکہ ہر دور کے ذہنی تحفظات و تعصبات کی پرچھائیاں اس دور کی تحریروں میں باقی رہتی ہیں، خواہ ان سے بچنے کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کی جائے اسلام پر ایک نئی کتاب لکھنا ضروری سمجھا، وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو یہ بات پسند نہیں کہ انھیں محمڈن اور اسلام کو محمڈن ازم کہا جائے، لیکن اس کے باوجود انھوں نے اسلام کو محمڈن ازم کہنا ضروری سمجھا، ان کے خیال میں ایسا کہنا غلط بھی نہیں کہ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ مسلمان بڑے فخر سے اپنے آپ کو امت محمدیہ کہتے تھے، دوسرے یہ کہ جو مسلمان لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہہ کر اسلام پر اپنے یقین کا اقرار کرتے ہیں تو اس کلمہ کے دوسرے جز کی اہمیت ان کے ذہن میں تمام مضمرات کے ساتھ موجود رہتی ہے، جب کہ کلمہ کے پہلے جز پر مسلمانوں کے علاوہ بہت سے غیر مسلموں کا اعتقاد اور ایمان ہو سکتا ہے، اگر محمدؐ کے زمانہ سے لے کر اب تک کوئی ایسی مثال نہیں کہ اس کلمہ کے منکرین کو کبھی مسلم کہا گیا ہو اور ان کو اسلامی برادری کا رکن سمجھا گیا ہو، برخلاف اس کے راسخ العقیدہ مسلمان شارحین کا موقف ہر دور میں یہی رہا ہے کہ کسی ایسے شخص کو جو علانیہ طور سے کلمہ کا اقرار کرتا ہو غیر مسلم نہیں کہا جا سکتا۔

پروفیسر ضیاء الحسن نے اپنے مقالہ کا اتنا حصہ پڑھ کر کہا کہ بعض اور اہم پوائنٹ ہیں، لیکن چونکہ وقت نہیں ہے، اب آپ سوال کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر سید سلمان ندوی: اس مقالہ کے بعد پروفیسر مشیر الحق اپنا مقالہ پیش کریں گے، اس کے بعد سامعین سوالات کر سکتے ہیں، وقت کم ہے، اس کے بعد چائے کا وقفہ بھی ہے، ڈاکٹر مشیر الحق کے

مقالہ کا عنوان "پروفیسر الفریڈ کانٹ ویل اسمتھ" ہے۔

ڈاکٹر شبیر الحق ندوی | جناب صدر! مضمون کا جو ابتدائی حصہ ہے میں نے اس میں پروفیسر کینٹ ویل اسمتھ
کی ذاتی زندگی کے بارے میں معلومات دی ہیں، ان کو وقت کی کمی کی وجہ سے چھوڑ رہا ہوں، مختصراً
اتنا بتا دوں کہ ان کی پیدائش کناڈا کے مشہور شہر ٹورنٹو میں ۱۹۱۶ء میں ہوئی، اب تک تقریباً سو تحقیقی
اور علمی مقالات اور لگ بھگ دس اہم کتابوں کے مصنف ہیں، ان کے بعض مضامین اور کتابوں
کے ترجمے عربی، ترکی، اردو، فرانسیسی، جرمن، انڈونیشی، جاپانی اور سویڈش زبانوں میں بھی شایع ہو چکے
ہیں، کچھ وقت انھوں نے دوسری جنگ عظیم سے پہلے ہندوستان میں لاہور کے فارمن کرسچین کالج میں
ایک استاذ کی حیثیت سے گذارا، جہاں ان کو ہندوستانی مسلمانوں سے ملنے کا پورا اتفاق ہوا اور
ان میں ایک خاص قسم کی تبدیلی یہ آئی کہ انھوں نے محسوس کیا کہ اسلام کا صحیح اور مکمل مطالعہ اس وقت
تک ممکن نہیں ہو سکتا جب تک کہ برصغیر کی اسلامی تاریخ کا مطالعہ پورے طور سے نہ کیا جائے، صرف
مڈل ایسٹ پر کنسنٹریٹ کرنے سے صحیح اسلام کا پرسپیکٹیو نظر نہیں آسکتا، انھوں نے اپنی مشہور کتاب
"ماڈرن اسلام ان انڈیا" لاہور ہی کے قیام میں ۱۹۴۳ء میں شایع کی جس کا شمار آج بھی ہم کلاسیکی ادب
میں کیا جاتا ہے، اسمتھ اس وقت تک تاریخ کے تجزیاتی مطالعہ میں مارکسی معیارات کو بنیادی جگہ
دیتے تھے، جس کی جھلک اس کتاب میں صاف نظر آتی ہے، اس کتاب کی اشاعت کے بعد ان کو اپنے
مارکسی نقطۂ نظر کی وجہ سے مذہبی عیسائی دنیا کی تنقیدوں کا ہدف بھی بننا پڑا، لاہور سے واپسی کے بعد
انھوں نے پرنسٹن میں فلپ کے. حتی کی نگرانی میں "مجلہ الازہر، تجزیہ و تنقید" کے موضوع پر مقالہ پیش کر کے
پی، ایچ. ڈی کی ڈگری حاصل کی، ۱۹۴۹ء میں وہ کمپریٹیو ریلیجین کے پروفیسر ہو کر میک گل یونیورسٹی چلے آئے،
جہاں دو ہی سال کے عرصہ میں انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کی بنیاد ڈالی اور اس میں ان کا تقرر
کی حیثیت سے ہوا، ان کا خاص نقطۂ نظر یہ رہا ہے کہ اسلام یا کسی بھی مذہب کے مطالعہ کے

سلسلہ میں جب تک جس مذہب کا مطالعہ کیا جا رہا ہو، اگر اس کے ماننے والے تقریباً اتنے ہی تعداد میں
موجود نہ ہوں جتنی تعداد میں دوسرے مذاہب کے ماننے والے موجود ہیں اس وقت تک مذہب کا
صحیح مطالعہ ایمانداری کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا، اسی بنیاد پر انھوں نے یہ شرط رکھی تھی کہ اپنے
دوران قیام میں انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز میں اساتذہ و طلبہ میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کا تناسب
پچاس پچاس فیصدی ہونا چاہیے، ۱۹۶۴ء میں ان میں یہ تبدیلی آئی کہ صرف اسلام کے مطالعہ کے
بجائے دنیا کے دوسرے بڑے مذاہب کا بھی مطالعہ کیا جائے، اس کے لیے میک گل کا میدان ان کے
لیے ذرا محدود تھا، اس لیے وہ ہارورڈ چلے گئے، وہاں انھوں نے کئی مذاہب کا مطالعہ کرنا شروع کیا
اس کے تعلیمی سینٹر کو انھوں نے رہایشی سینٹر میں تبدیل کر دیا، جہاں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے
تھے، یہ تو ان کی ذاتی زندگی کی ایک جھلک تھی، اب میں ان کے خیالات کی بھی ایک جھلک پیش کر رہا ہوں

اسمتھ اپنے فکر و عمل دونوں کے اعتبار سے خود بھی مذہبی ہیں اور دوسروں کو بھی ان کے
مذاہب پر عمل پیرا دیکھنا چاہتے ہیں، تقویٰ ان کے خیال میں کسی مخصوص مذہب کی ملکیت نہیں، یہ خدا
اور انسان کے باہمی تعلق کے نتیجہ میں وجود میں آتا ہے، یہ تعلق جتنا مضبوط ہوگا، فرد کی مذہبی زندگی اتنی
ہی قابل رشک ہوگی، اسمتھ کے نقطۂ نظر سے مذہب کی دو جہتیں ہوتی ہیں، ایک کو وہ انفرادی کیفیت
کہتے ہیں اور دوسرے کو اجتماعی روایات، انفرادی کیفیت کو اسمتھ اپنی زبان میں faith اور
ہماری زبان میں ایمان کہتے ہیں، اگرچہ ایمان کی دولت کے بغیر کوئی شخص مذہبی نہیں ہو سکتا، لیکن
ایمان کو ناپنے کا کوئی پیمانہ نہیں ہے، یہ چونکہ ایک اندرونی کیفیت ہے اس لیے ضروری نہیں ہے
کہ ایمان میں حالات کے تحت تغیر و تبدل نہ ہو سکے اور نہ ہر شخص کے ایمان کا پلہ برابر ہو سکتا ہے،
دوسرے لفظوں میں اسمتھ ایمان ہر کس بقدر ہمت اوست کے قائل ہیں، افراد کی سطح پر کمیت و کیفیت کے
فرق کے باوجود مذہب کی دوسری جہت یعنی کسی مذہب کے پیرووں کی اجتماعی روایات کا ———

Commulative Tradition نام دیتے ہیں، ظاہر میں مشاہدہ کیا جا سکتا ہے، اگرچہ ان میں زمان ومکان کے فرق کی وجہ سے تغیر وتبدل ہوتا رہتا ہے، تاہم ان روایات میں چونکہ ایک تسلسل ہوتا ہے اس لیے وہ کسی مذہب کا مطالعہ کرنے کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی ہیں، اور چونکہ روایات، زمان ومکان کے فرق سے تبدیل ہوتی رہتی ہیں اس لیے اگر اس جہت سے دیکھا جائے تو ایک سے زیادہ مذاہب کا وجود ثابت ہو جاتا ہے، لیکن اگر اندرونی کیفیت یا ایمان کو مذہب کا معیار مانا جائے تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ایک سے زیادہ ایمان کا وجود ممکن ہے، ایمان کی اجتماعی شکلیں مختلف ہو سکتی ہیں، لیکن ایمان ہمیشہ واحد ہی رہے گا، اسے جمع کے صیغے میں استعمال نہیں کیا جا سکتا، یہی وجہ ہے کہ اسمتھ اپنی تحریروں میں faith کو ہمیشہ واحد کے صیغہ میں لکھتے ہیں، اپنی پرانی تحریروں میں انھوں نے جہاں کہیں ضرورۃً جمع کے صیغہ میں لکھا تھا اسے دوبارہ اشاعت کے وقت form of faith (ایمان کی مختلف شکلوں) میں بدل دیا۔ ایمان اسمتھ کے نزدیک ایک انفعالی کیفیت کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ ایک معاہدہ ہے جو بندہ اپنے خدا سے کرتا ہے، جس کی رو سے وہ اپنی مرضی کو خدا کی مرضی کے تابع کر دیتا ہے، یہی وہ مقام ہے جہاں ایمان کا اظہار ہوتا ہے، اور یہ ایک شکل اختیار کر لیتا ہے، خدا پر ہمارا ایمان جتنا زیادہ مکمل ہوگا اتنا ہی ہم اس کے تابع اور فرماں بردار بندے ہوں گے، اس اتباع اور فرماں برداری کو اسمتھ اسلام کہتے ہیں، اسلام ان کے نزدیک دراصل ایمان کے اظہار کا نام ہے، اس نتیجہ پر پہونچ جانے کے بعد اسمتھ بھی یہی کہتے ہیں اِنَّ الدّین عند اللہ الاسلام، لیکن اس کی تشریح میں وہ ہم سے اختلاف کرتے ہیں، ہم یہاں اسلام کو اسم معرفہ سمجھ کر اپنا اسلام مراد لیتے ہیں اور اسمتھ اسے اطاعت خداوندی کے معنوں میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، اسلام کے اسم فاعل مُسلِم کی تشریح بھی وہ لغوی اور اصطلاحی دونوں طرح سے کرتے ہیں، لغوی حیثیت سے مسلم کا مطلب ہے فرماں بردار بندہ، لیکن اب اصطلاحاً مسلمان ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو تاریخی مذہب اسلام کی

پیروی کو ذریعہ نجات سمجھتے ہیں، اگر ہم بات کو واضح کرنے کے لیے تھوڑی دیر کے واسطے دو الگ الگ ہم معنی لفظ مسلم اور مسلمان استعمال کریں جن میں اول الذکر کو لغوی معنی میں لیں اور آخر الذکر کو اصطلاحی معنی میں تو پھر اسمتھ بلا کسی جھجک کے انگریزی میں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ میں مسلمان نہیں ہوں لیکن اسی بات کو وہ عربی میں مسلم کے لغوی معنی کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنے بارے میں لَستُ بِمُسلِمٍ کہنے پر کبھی تیار نہ ہوں گے، کیونکہ اس اعلان کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ خدا کے فرماں بردار بندے نہیں اور یہ بات ان کے عقیدہ وعمل کے مطابق درست نہیں ہے، خدا کی مرضی کا وہ جس حد تک اپنی صلاحیتوں کے مطابق سمجھ پائے ہیں، اس کے تحت ان کی پوری زندگی ایک بندہ مسلم کی زندگی ہے، لیکن اصطلاحی معنوں میں مسلم نہ کہنے کی ایک وجہ تو ان کے خیال میں یہ ہے کہ وہ اتفاق سے کسی مسلم گھرانے میں پیدا نہیں ہوئے، دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے اس دعوے سے متفق نہیں کہ اصطلاحی طور سے مسلمان ہوئے بغیر خدا کی مرضی کے آگے سر نہیں جھکایا جا سکتا، انھوں نے جس طریقہ سے اپنے کو خدا کے سپرد کیا ہے وہی سپردگی ان کے نزدیک الاسلام ہے، کیتھولک انسائیکلوپیڈیا کی تشریح کے مطابق دین یا ریلیجن خدا کے حضور بندوں کی اختیاری سپردگی کو کہتے ہیں، پروفیسر اسمتھ کا اصرار ہے کہ اگر ہم کیتھولک پادریوں یا دوسرے عیسائی علماء کا مطالعہ کریں تو ہم دیکھ لیں گے کہ وہ ریلیجن کی مذکورہ بالا تعریف کے پیش نظر صبح وشام اپنی زبان میں اِنَّ الدّین عند اللہ الاسلام کا ورد کر رہے ہیں، اس کے باوجود انہیں اس پر بھی اصرار ہے کہ وہ مسلمان نہیں ہیں، گویا اسلام ان کا دین تو ہے لیکن وہ خود مسلمان نہیں، یہ ظاہری تضاد بیانی اس وقت ختم ہو جاتی ہے جب یہ واضح کر دیا جائے کہ عیسائی علماء اور پادری اور خود اسمتھ جس اسلام کو اپنا دین کہتے ہیں وہ اس اسلام سے قطعاً مختلف ہے جو صدہا برس کے تاریخی وسماجی عوامل کے ایک خاص مذہبی طرز فکر کا مرادف بن گیا ہے، اسمتھ کو یقین ہے کہ اسلام کا جو مفہوم وہ سمجھ رہے ہیں، وہ قرن اول کے مسلمانوں کی تشریحات سے مختلف نہیں ہے، مثلاً طبری اور ان کے ہمعصر مسلمانوں کے بارے میں انکا خیال ہے کہ وہ لوگ اسلام کا مفہوم اطاعت اور بندگی ہی لیتے ہیں، یہ تصور کہ اسلام ایک مذہب کی حیثیت سے مکمل، جامع اور متعین نظام ہے

ان کے خیال میں کم از کم قرن اول کے مسلمانوں کے لیے اجنبی تھا، مثلاً قرآنی آیات وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ اور رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا کی تشریح کرتے وقت طبری اسلام کا مطلب بتاتے ہیں: الاستسلام لامری والانقیاد لطاعتی علیٰ ما شرعت لکم من حدودہ وفرائضہ۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مسلمان بھی طبری کی اس تشریح سے اختلاف نہیں کرتے، کیونکہ وہ بھی یہی سمجھتے ہیں، اسلام اللہ کی مقرر کردہ حدود و فرائض کی پابندی کا نام ہے، اور اسمتھ بھی یہی کہتے ہیں، لیکن جب ہم اس سے آگے بڑھ کر تفصیلات میں داخل ہوتے ہیں تو ہم اور اسمتھ الگ الگ راہوں پر چل پڑتے ہیں، ہمارے نزدیک اللہ کی مقرر کردہ حدود و فرائض من و عن وہی ہیں جنھیں ہم شریعت اسلامیہ کہتے ہیں، اس لیے مسلمان ہونے کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں کہ انسان شریعت اسلامیہ کی بالادستی کو بھی قبول کرلے، اسمتھ کو ہماری تشریح سے اتفاق نہیں ہے، وہ اطاعت الٰہی کو شریعت اسلامیہ میں محدود نہیں سمجھتے، شریعت اسلامیہ اسمتھ کے نزدیک دراصل مذہب کے اس رخ سے تعلق رکھتی ہے جسے وہ اجتماعی روایات کہتے ہیں، جس کا وجود ایک سے زیادہ شکلوں میں ممکن ہے۔

اسمتھ کو شماریات سے بھی کافی دلچسپی ہے اور نتائج نکالنے میں اس سے مدد لیتے رہے ہیں، ایمان اور اسلام کی بحث میں یہ دکھانے کے لیے کہ اصل چیز ایمان ہے اور قرآن نے اسی پر زور دیا تھا، لیکن جیسے جیسے مسلم سماج منظم ہوتا گیا اور دوسرے مذاہب کی طرح ایک مخصوص مذہب کی شکل اختیار کرتا گیا، ایمان کے بجائے اسلام پر زور دیا جانے لگا، قرآن میں ایمان اور اسلام نیز ان کے مختلف مشتقات کی تعداد کی بنیاد پر اسمتھ نے ۸۵ (۸۵.۱٪) اور ۱۵ (۱۴.۹٪) کی نسبت دکھائی ہے، اس کے بعد انھوں نے قرن اول اور زمانہ وسطیٰ کی عربی کتابوں کے ناموں کی بنیاد پر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ سنہ ۱۳۰۰ھ تک یہ نسبت ۸۵ اور ۱۵ کے بجائے ۴۰ اور ۶۰ کی ہوجاتی ہے، عہد جدید یا چودھویں صدی میں ایمان اور اسلام کا تناسب بالکل بدل جاتا ہے، اور دونوں میں ۷ (۷.۱٪) اور ۹۳ (۹۲.۹٪) کی نسبت رہ جاتی ہے۔

ڈاکٹر سید سلمان ندوی: ذرا وقت کا لحاظ رکھیں۔

پروفیسر مشیر الحق: کیا میرا وقت ختم ہوچکا ہے؟ میرے مقالہ میں اس مسئلہ پر کچھ روشنی ہے جس میں یہ بحث اٹھائی گئی ہے کہ اسلام کو محمڈن ازم کہا جاسکتا ہے یا نہیں؟

اسمتھ کو پوری طرح اصرار ہے کہ مسلمانوں کو مسلم اور اسلام کو اسلام ہی کہا جانا چاہیے، اور اس سلسلہ میں وہ اتنے سخت رہے ہیں کہ اپنی تحریروں اور ریڈیو کی تقریروں کے ذریعہ تقریباً پچھلے چالیس پینتالیس[۴۵] برسوں سے اس پر زور دیتے رہے ہیں کہ مسلم ہی استعمال کیا جائے، بلکہ جس زمانہ میں پروفیسر گب کی کتاب محمڈن ازم شایع ہوئی تھی جس کی طرف پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی صاحب نے اشارہ کیا ہے تو اسمتھ نے اس نام کو پسند نہیں کیا تھا اور نہ ہی وہ گب کی اس معذرت سے متاثر ہوئے تھے کہ یہ نام ان کی اپنی پسند سے نہیں بلکہ ناشر کی اپنی تاجرانہ پالیسی کی وجہ سے رکھنا پڑا ہے، لیکن اب اسمتھ آہستہ آہستہ یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ اس معاملہ میں ان کا بے لچک اصرار شاید ضرورت سے کچھ زیادہ ہے اور گب کی کتاب کا عنوان بالکل بے بنیاد نہیں کہا جاسکتا اور اس کی بہت بڑی وجہ یہ ہے جو ضیاء صاحب اپنے مقالہ میں پیش کرچکے ہیں کہ مسلمانوں کو آنحضرت ﷺ سے جو تعلق ہے اور کلمہ کا جو دوسرا جزء ہے اس پر جتنا اصرار ہے اس کی روشنی میں اور خود مسلمانوں کی زندگی اور ان کی تحریروں کا مطالعہ کرکے انھوں نے پیش کیا ہے کہ مسلمانوں کو کوئی شخص محمڈن یا اسلام کو محمڈن ازم کہتا ہے تو پھر اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی بنیاد ہے، اس زبانی تقریر کے بعد پروفیسر مشیر الحق نے اپنے مقالہ کا آخری حصہ پڑھا جو یہ تھا:

آپ نے ایسے مضامین پڑھے ہوں گے جن میں ایک شاعر یا افسانہ نگار یہ بتانے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ افسانہ کیوں لکھتا ہے یا شعر کیوں کہتا ہے، اسمتھ نے اس قسم کا کوئی مضمون نہیں لکھا ہے، یا کم از کم میری نظروں سے نہیں گذرا ہے کہ وہ اسلامی موضوعات پر کیوں لکھتے ہیں، لیکن اگر اس سوال کا جواب ہم ان کی مختلف تحریروں میں تلاش کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ وہ نہ تو اتنے بددیانت ہیں کہ دنیا کے سامنے اسلام کی

غلط تصویر پیش کرنے کی خاطر اس میدان میں آئے ہیں اور نہ ہی اتنے خوش فہم ہیں کہ سمجھتے ہوں کہ وہ اس طرح چند مسلمانوں کے دل میں گھس کر انھیں اسلام سے برگشتہ کر سکیں گے اور یوں عیسائیوں کی تعداد میں اضافہ کا سبب بنیں گے، اسمتھ کو اس بات پر انشراح صدر ہے کہ یہ دور بڑے پیمانہ پر اجتماعی تبدیلیٔ مذہب کا امکان نہیں رکھتا، اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ عالمی سطح پر انسانی معاشرہ اتنا کاسموپولیٹین ہوتا جارہا ہے کہ اب ایک عیسائی یا ایک یہودی یا ایک لاادریا (Agnostic) خود اپنے گھر میں اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ اس کا پڑوسی ایک ذہین، باعمل، متقی، پرہیزگار بدھسٹ ہو یا ہندو ہو یا مسلمان ہو، اب ان سب کو اگر ایک ساتھ رہنا ہے تو انھیں ایک دوسرے کے مذہب سے بھی پوری واقفیت رکھنی چاہیے، یہاں ایک مسئلہ اور چھیڑنے کو جی چاہتا ہے، اکثر لوگ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ اگر مستشرقین اپنے اس دعوی میں صادق ہیں کہ وہ اسلام کا مطالعہ خلوص نیت کے ساتھ کرتے ہیں تو پھر وہ مسلمان کیوں نہیں ہوجاتے، یہ سوال خاصا اہم ہے، اور چند لفظوں میں اس کا جواب نہیں دیا جاسکتا، ممکن ہے کہ کسی دوسرے پرچے میں اس پر روشنی ڈالی گئی ہو لیکن جہاں تک اسمتھ کا سوال ہے، ان سے اگر خود انہی کے بارے میں یہ بات پوچھی جائے تو ممکن ہے وہ پلٹ کر جواب دیں کہ کیوں آخر میں مسلمان کیوں ہوجاؤں جب میں خود ایمان کی دولت سے سرفراز ہوں، اور عیسائی ہوتے ہوئے مجھے قلب کا اطمینان حاصل ہے، تو پھر میں اپنا مذہب کیوں چھوڑوں، شکریہ، لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ

اس مقالہ کے ختم ہونے کے بعد کچھ سوالات کیے گئے۔

مولانا تقی الدین ندوی: سوال کرنا ہے، پروفیسر اسمتھ کے بارے میں جناب مشیر صاحب نے جو تحقیقات پیش کی ہیں خاص طور سے الاسلام اور الایمان کے بارے میں، میرا خیال ہے کہ یہاں اَل کو اسمتھ صاحب سمجھے ہی نہیں، ال یہاں تخصیص کے لیے ہے الاسلام سے خاص اسلام مراد ہے اور الایمان سے خاص ایمان مراد ہے، یہ وہ اصطلاح ہے جسے قرآن نے

استعمال کیا ہے اور جس کے بارے میں کہا ہے کہ وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ اور یہ اسلام اور یہ ایمان جسے اسمتھ یہ کہتا ہے کہ پہلی صدیوں میں کچھ اور سمجھا جاتا رہا اور بعد کی صدیوں میں کچھ اور، در آنحالیکہ قرآن خود کہتا ہے اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا اسلام مکمل اور جامع تو نازل ہی ہوا، جس طرح پہلی صدیوں میں سمجھا جاتا رہا بعد کی صدیوں میں بھی سمجھا جاتا رہا، اور طبری کی ایک عبارت نقل کرکے یہ کہنا کہ شروع کی صدیوں میں مسلمانوں کو فی امرہ ونہیہ میں اختلاف نہیں ہوا تو اس سے مراد اوامر خدا کی پابندی ان حدود میں ہے جن کو خدا اور پیغمبر اسلام نے متعین کیا ہے، ہر شخص کی ایک اصطلاح ہوتی ہے، قرآن کی ایک اصطلاح ہے اور اسی اصطلاح کے مطابق ایمان و اسلام کو اسمتھ صاحب کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے تھی، لیکن اسمتھ نے ایک طرف تو یہ کہا کہ ہم ایمان کے لغوی اور اصطلاحی معنی مراد لے رہے ہیں، کون اصطلاحی معنی اور کون سی اصطلاح؟ اگر وہ اس اصطلاح کو مراد لیتے ہیں جو قرآن نے مراد لی ہے تو پھر کوئی اختلاف ہی نہیں لیکن وہ اس کو لغوی معنی میں اطاعت خداوندی سے مراد لیتے ہیں، تو یہ حقائق کے بھی خلاف ہے اور اصطلاحات کے بھی خلاف، میرے خیال میں ان کو غلط فہمی اَل سے ہوئی ہے، اَل تخصیص کے لیے ہی، مخصوص اسلام اور مخصوص ایمان مراد ہے، یعنی وہ اسلام جو قرآن نے پیش کیا ہے نہ کہ وہ اسلام جو ہر شخص پیش کرے۔

مشیر الحق صاحب:- جو بات مولانا نے فرمائی وہ تو میں خود ہی کہہ چکا ہوں مسلمانوں کے نقطۂ نظر میں اور اسمتھ کے نقطۂ نظر میں زمین اور آسمان کا فرق ہے، اب یہ بات کہ اَل کا جو فرق ہے اسے اسمتھ سمجھے بھی ہیں کہ نہیں؟ یہ مجھ پر بھی بڑا ظلم ہے اور اسمتھ پر بھی ہوگا، مقالہ پیش کرنے کے لیے تو ۵، ۷ منٹ کا وقت دیا جائے اسے بھی کاٹ چھانٹ دیا جائے، اس مقالہ کا مقصد اسمتھ کے خیالات کو پیش کرنا تھا، ظاہر ہے ہم ان کی ساری باتوں کو صحیح نہیں سمجھتے، جہاں اختلاف تھا وہ پیش کر دیا گیا، صرف ایک کنکر پھینکنا ہے تالاب میں کہ ممکن ہے کسی خدا کے بندے کو یہ شوق پیدا ہوجائے کہ بھئی ان کو پورا پڑھیں۔

تقی الدین صاحب:- تو آپ نے پورا پڑھ لیا ہوتا، اخیر تک، تاکہ بات واضح ہوجاتی۔

شبیر الحق صاحب: میں نے پڑھ لیا لیکن یہاں پیش کرنے کے لیے اتنے چھوٹے سے مقالہ کو تو پورا وقت نہیں دیا گیا، پھر ایک لمبے مقالہ کی کہاں گنجائش نکل سکتی ہے، لیکن ایسا نہیں ہے کہ ہم ان چیزوں کو سمجھتے نہیں جس طرح مستشرقین کی تحریروں پر گفتگو ہوتی رہی ہے، اس میں یہ ظاہر کرنا ہے کہ وہ ہماری چیزوں کو کس طرح پیش کرتے ہیں، ہم مستشرقین کی صف میں اسمٰعیل کو رکھتے ہی نہیں۔

| ڈاکٹر عابد رضا بیدار | ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری پٹنہ نے سوال کیا کہ اسلام ہر دور میں رہا ہے اور خدا کا پسندیدہ دین ہے، اس کی اصلاح شدہ اور آخری شکل محمد رسول اللہ صلعم لے کر آئے تو اگر اس کو محمدیت یا محمڈن ازم اور اس کے پیروؤں کو محمدی یا محمڈن کہیں تو کیا حرج ہے؟

| مفتی عتیق الرحمٰن صاحب | مولانا تقی الدین صاحب کا ارشاد اپنی جگہ پر درست ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ اس میں لہجہ کی اتنی کرختگی نہ ہونی چاہیے جو مولانا نے اپنے جذبۂ اخلاص کی بنیاد ہی پر اختیار کیا ہوگا، مستشرقین کے مسئلہ کے بارے میں ہمیں اس لحاظ سے بہت تنقیحات اور چھان بین کرنی پڑے گی کہ مستشرقین کے جو نظریات ہیں، خود ہم مسلمانوں پر ان کے کیا اثرات پڑ رہے ہیں، ہمارا جو قدیم طبقہ ہے وہ کسی اور ڈھنگ سے سوچتا ہے، اور جو جدید طبقہ ہے، وہ اور طریقے سے سوچتا ہے، بہت سے ایسے مسائل ہیں جن میں خود ہمارے یہاں اختلافات بہت ہیں، چاہے ہم ان سے اتفاق کریں یا نہ کریں لیکن بہر حال اختلاف ہے، ان اختلافات میں کسی نے اگر کوئی پہلو اختیار کر لیا ہے جو ہمارے یہاں مشہور و معروف نہیں ہے تو ہمیں اس پر زیادہ ناراض نہ ہونا چاہیے، اس لیے ہمارا خیال ہے کہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کی تشریحات کے بعد مسئلہ صاف ہو جائے گا، یہ بات بھی ہے کہ مقالات کا جب ہجوم ہوتا ہے تو وقت کا سوال پیدا ہوتا ہے، مقالہ نگار کو تکلیف ہوتی ہے کہ وہ بہت سے اہم پوائنٹ کو ظاہر نہیں کر پاتا، اسی لیے میں کہا کرتا ہوں کہ مقالات کے پہلوانوں کی دنیا الگ ہی ہے، یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ کسی پہلوان کو زیادہ وقت یا کم وقت ملا، بس ایک انداز ہے اسی لحاظ سے غور کرنا چاہیے۔

| مولانا ابوالحسن علی ندوی | جناب عابد رضا بیدار ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری پٹنہ نے یہ سوال کیا کہ اسلام ہر دور میں رہا ہے اور خدا کا پسندیدہ دین ہے اس کی اصلاح شدہ اور آخری شکل محمد رسول اللہ صلعم لے کر آئے، تو اگر اس کو محمدیت اور اس کے پیروؤں کو محمدی یا انگریزی میں محمڈن کہیں تو کیا حرج ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ خدا نے اس دین کا نام اسلام رکھا ہے جو ہر پیغمبر لے کر آیا ہے، حضرت ابراہیم کے بعد کئی اولو العزم پیغمبر حضرت موسیٰ؏، حضرت عیسیٰ؏ آئے اور پھر آنحضرت صلعم آئے، کہیں مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے قرآن نے کہا ہے کہ مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِن قَبْلُ وَفِي هَٰذَا لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ (حج: ۷۸) تو معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیم؏ نے بھی اس دین کو اسلام کا نام دیا تھا اور ظاہر ہے کہ اس وقت مسلمان موجود نہیں تھے، ابراہیم؏ کے بعد جتنے پیغمبر آئے اور جو امتیں ہوئی ہیں، وہ پیغمبر اسلام کے داعی تھے اور امتیں اسلام کی متبع تھیں، لیکن ان دونوں باتوں میں بڑا فرق ہے کہ محمد رسول اللہ صلعم نے اسی اسلام کو جو ہمیشہ سے آ رہا تھا کی تحریفات کو دور کر کے اس کو اپنی شکل میں پیش کیا ہے اور اب وہی اسلام معتبر ہے جس کو رسول اللہ صلعم نے پیش کیا تھا اور جو آپ صلعم لے کر آئے، اور اس میں کہ اب اسلام کو محمدیت کہا جائے اور امت اسلامیہ کو محمڈیون کہا جائے میں اس میں فرق سمجھتا ہوں، اس میں یورپ کی ایک سازش تھی کہ مسلمانوں کو محمڈن کے نام سے یاد کرنا شروع کر دیا، اور یہ سازش بڑی ذہانت پر مبنی تھی، اس کی تائید شبیر الحق صاحب کے مقالے سے بھی ہوتی ہے، اور ہندوستان کے مسلمان کسی وجہ سے بھی جس میں بدنیتی کا شبہہ میں نہیں کرتا اس میں محبت رسول صلعم کا بھی دخل ہو سکتا ہے کہ انھوں نے اپنے اداروں کا نام شروع شروع میں محمڈن اورینٹل کالج، محمڈن عربک کالج یا ایک زمانہ میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا نام محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس تھا اور اب محمڈن لا کے نام سے ہمارا اسلامی قانون ہے، وہ اس وقت تک رائج ہے لیکن بعد میں مسلمانوں کو خود اس کا احساس ہوا اور کئی اداروں اور تحریکوں کا نام بدل گیا، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا نام مسلم ایجوکیشنل کانفرنس پڑ گیا اور ہم مسلمانوں کو بس پر اصرار کرنا چاہیے کہ اسلام کو اسلام کہا جائے اور مسلمانوں کو مسلمین اور امت مسلمہ کہا جائے هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ سے قرآن مجید نے اس پر آخری مہر لگا دی ہے، اسلام نے اس کا اتنا لحاظ کیا ہے کہ اپنی تقویم کا نام بھی محمدی تقویم نہیں رکھا بلکہ ہجری تقویم

رکھا، اس وقت دنیا میں جتنی تقویمیں موجود و زندہ ہیں، وہ کسی نہ کسی شخصیت کی طرف منسوب ہیں، عیسوی تقویم
یہودی تقویم یا خود ہندوستان میں جو تقویم رائج تھی وہ بھی ایک مشہور بادشاہ کے نام سے تھی، مسلمانوں نے
اپنی اسلامی تقویم کا نام ہجری رکھا اس لیے کہ اس میں ایک پیغام ہے، میں پورے احترام کے ساتھ جو ایک ادنیٰ
مسلمان غلام کو ہو سکتا ہے کہہ سکتا ہوں کہ محمدی کہلانے میں یا محمدیت میں وہ پیغام نہیں ہے، یعنی وہ ذہن کو
اس طرف متوجہ نہیں کرتا، وہ شخصیت کی طرف مائل کرتا ہے، اس کا نفسیاتی و ذہنی اثر یہ ہوتا ہے کہ اصل چیز شخصیت
ہو جاتی ہے، اور اسلام یہ بتاتا ہے کہ اصل چیز ہے عقیدہ، اور وہ شخصیت اس لیے محترم و محبوب ہے کہ اس عقیدہ کو
لے کر آئی ہے اور اس نے دعوت پیش کی، قربانیاں دیں اور وہ خدا کی محبوب ترین شخصیت تھی، اگر بے ادبی نہ ہو تو
اس سلسلہ میں آنحضرت ﷺ کی حس اتنی بیدار و حساس تھی کہ ایک اعرابی نے کہا تھا کہ مَا شَاءَ اللّٰهُ وَشِئْتَ (جو اللہ
چاہے اور آپ چاہیں) آپ ﷺ تاب نہ لا سکے اور فرمایا: اجعلتنی للّٰہ ندًّا، ما شاء اللّٰہ وحدہٗ (ماشاء
اللّٰہ وحدہٗ) (کیا تم مجھے اللہ کا شریک بناتے ہو؟ تنہا خدا چاہے، تنہا خدا چاہے) اور اسی طریقہ سے مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ
وَالرَّسُوْلَ (جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرتا ہے) تو اس میں بھی آپ ﷺ نے تھوڑا فصل کرنا چاہا مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ
وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ (جو اللہ کی اطاعت کرتا ہے اور جو رسول کی اطاعت کرتا ہے) یعنی اسم موصول کا لفظ
بیچ میں آئے، لیکن آپ نے اس کو برداشت نہیں کیا کہ اللہ اور رسول کا نام اس طرح آئے جس طرح ہماری بعض
مسجدوں کی محرابوں میں لکھا جاتا ہے اللہ محمد، اللہ محمد، بعض مرتبہ تو مجھے خیال آتا ہے کہ بڑے چھوٹے
بھائی یا دو بزرگ تھے جن کا نام ساتھ ساتھ لکھ دیا گیا ہو، میں اس کی جرأت تو نہیں کر سکتا کہ مسلمانوں کا
جو مزاج ہے اس پر یہ کہوں کہ یکخط نسخ پھیر دیا جائے یا الگ الگ لکھا جائے، لیکن ایک موحد مسلمان کے ذہن پر
چوٹ لگتی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کو اس بارہ میں ہمیشہ حساس اور ذکی الحس ہونا اور بیدار مغز رہنا چاہیے
کہ وہ کسی سازش کے شکار نہ ہوں، اور بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر، یہ ہمارا ایمان ہے، اس کے باوجود ہم اتنا
اصرار کریں گے کہ اسلام کو اسلام کہا جائے اور مسلمانوں اور اس کے پیرووں کو امت مسلمہ کا نام دیا جائے، ان

دونوں میں فرق یہ ہے کہ ہم کہیں کہ وہ اسلام جسے صحیح شکل میں رسول اللہ ﷺ لے کر آئے تھے اور جس کا
کلمہ جامعہ لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ ہے، لیکن ہم اسلام کو اسلام ہی کہیں گے، اور خدا
کا شکر ہے جیسا کہ مشیر الحق صاحب نے بتلایا کہ اسمتھ صاحب کو بھی اس کا احساس ہے کہ اسلام کو اسلام
ہی کہنا چاہیے، محمڈن ازم نہیں کہنا چاہیے، باقی میں آخیر میں یہ عرض کروں گا کہ شروع سے آپ
دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے اس علمی مذاکرہ کا وہ نقطہ جس پر تقریباً ابھی تک سب کا اتفاق رہا ہے
کہ مستشرقین اپنی ساری روشن خیالیوں اور اپنے سارے وسعت مطالعہ اور وسعت ذہنی کے
باوجود بہرحال وہ یہودی اور عیسائی ہیں، اور مشیر صاحب نے بھی اس کا اظہار کیا ہے، ہمیں کبھی نہیں
بھولنا چاہیے کہ وہ یہودی اور عیسائی ہیں، اور جیسا کہ پروفیسر ضیاء الحسن صاحب فاروقی نے
کہا کہ وہ دعویٰ تو کرتے ہیں معروضی نقطۂ نظر کا، لیکن کانٹ کی آخری تحقیقات سے دو سو ۲۰۰ برس پہلے
حضرت مجدد الف ثانیؒ نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ عقل مجرد کا وجود نہیں ہے، میں اس سے آگے
بڑھ کر کہوں گا کہ علم مجرد کا بھی وجود نہیں ہے، تحقیق مجرد کا بھی وجود نہیں ہے، اس میں قدیم عقائد جو
راسخ ہو چکے ہیں، رگ و پے میں سرایت کر چکے ہیں، خاندانی روایات کے، ماحول کے اثرات، مسلمات بے اصل
مسلمات کا سایہ اس طرح پڑتا ہے کہ اس میں مدعی کو یا داعی کو یا محقق کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا ہے کہ
اس نے جو نظریہ علم مجرد اور تحقیق خالص کے طور پر پیش کیا ہے وہ تحقیق خالص ہے یا ممزوج ہے، یا
ایک آمیزہ ہے پرانے اثرات کا، مستشرقین کی تحقیقات نے ایک اور مہر تصدیق ثبت کر دی ہے،
حضرت مجدد الف ثانیؒ نے محض اپنے سلامت قلب اور تائید الٰہی سے جو بات آج سے سوا تین سو
برس پہلے کہی تھی کہ نہ تو عقل خالص کا وجود ہے نہ کشف خالص کا، سب متاثر ہوتے ہیں، تحت الشعور
سے اور تحت الشعور کے اندر جو مکنونات ہیں، جو مخزونات ہیں، جو پہلے سے خزانہ ہے، اس سے متعلق ہوتے ہیں، میں
ان الفاظ کے ساتھ اپنی بات ختم کرتا ہوں ۔ اس کے بعد مذکورۂ بالا خیالات کو مولانا نے عربی زبان
میں بھی پیش کیا ——— (دوسری نشست یہیں ختم ہوئی)

دار المصنفین کے بین الاقوامی سمینار

سے متعلق

ایک اہم مکتوب

کراچی :- ۲۹ر اپریل ۱۹۸۲ء

محترمی و مکرمی جناب سید صاحب   السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

نامۂ گرامی مورخہ ۱۰ر اپریل ۱۹۸۲ء کے لئے ممنون ہوں، اور کلماتِ خیر کے لئے بہ صمیم قلب متشکر، میں کل شام کو ہی شمالی کوریا اور چین کے ۱۷ روزہ دورے سے واپس آیا ہوں، اور اب پرسوں پشاور اسلام آباد اور لاہور جا رہا ہوں،

میں نے تجاویز پر آج اطمینان سے غور کیا، چند اشارات درج ذیل کرتا ہوں،

۱- سب سے پہلا کام یہ ہونا چاہئے کہ ان تجاویز کا انگریزی اور عربی ترجمہ ہونا چاہئے اور یہ تجاویز فوری طور پر ایک مناسب خط کے ساتھ ان ۱۹ ارکان کو بھجوا دیجئے، جن کا ذکر ان تجاویز میں ہے، ان حضرات کو علم ہونا چاہئے کہ وہ کس کمیٹی کے رکن نامزد ہوئے ہیں، اور ان سے تعاون کی درخواست کرنی چاہئے،

۲- دار المصنفین میں ایسے علمائے اسلام کی فہرست ضرور ہونی چاہئے جو اسلامیات پر کام کر رہے ہیں اور دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں، ان اکابر رجال کو تجویز نمبر ۱ پر متوجہ کرنا چاہئے، کہ وہ اپنے مطالعہ میں اس مسئلے کو پیش نظر رکھیں اور خلاف اسلام تحریرات کا

پورا پورا نوٹس لیں،

میری رائے ہے کہ ان سب حضرات کرام کو انگریزی اور عربی میں یہ تجاویز بھجوائی جانی مناسب ہوں گی، کیونکہ ایسے ہی محققین سے دوسری تجاویز کا بھی گہرا تعلق ہے،

۳- چند سال ہوئے مکۃ المکرمہ میں اولین کانگریس عالمی تعلیم پر ہوئی تھی، میں بھی اس میں مدعو تھا، اور وہاں میں نے بعض اہم تجاویز سامنے رکھی تھیں ان میں ایک اہم تر یہ ہے کہ تمام عالم اسلام میں پرائمری تعلیم میں یکسانیت پیدا کرنی چاہئے اور نصاب تعلیم مرتب کرکے پوری یکسانیت کے ساتھ تمام عالم اسلام میں نافذ و رائج کرنا چاہئے، اس قسم کی دوسری تجاویز بھی تھیں، مگر ان میں سے کسی ایک پر بھی آج تک عمل نہیں ہوا ہے، اگر آپ مناسب خیال فرمائیں تو ڈاکٹر علی اشرف صاحب (معرفت ملک عبدالعزیز یونیورسٹی مکۃ المکرمہ) سے رابطہ قائم فرما لیجئے کہ انہی کو یہ مقام حاصل تھا کہ وہ یہ کانفرنس وہاں کرائیں، اس کانفرنس کی روداد بھی بڑے اہتمام سے لندن میں چھپی ہے،

۴- میری رائے میں تجویز نمبر ۳ اس دائرہ میں بمشکل ہی آسکتی ہے کہ جو مستشرقین عالمی کانفرنس (اعظم گڈھ) نے متعین کیا ہے اس پر عمل مشکل ہوگا، اور اس سے مقاصد کانفرنس کا گہرا تعلق بھی نہیں ہے،

۵- اگر ہم اپنی جد و جہد کو اس حد تک مرکوز رکھیں کہ مستشرقین اسلام کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کرنے سے باز آجائیں اور فکری و علمی انداز پر بعض مستشرقین کو راہ صحیح بتا سکیں تو اس سے دائرۂ کار کا احترام ہو سکے گا،

۶- خود ہندوستان میں ایسے علمائے کرام موجود ہیں کہ جو اس انداز سے کام کر سکتے ہیں، ان کے حاصل مطالعہ اور نگارشات کی اشاعت کا اہتمام ہونا چاہئے،

یہ چند نکات ہیں کہ جو اس وقت ذہن میں آئے ہیں، آپ کو یاد ہوگا کہ ڈاکٹر سلمان صاحب منٹگمری واٹ کے سب سے زیادہ نقاد تھے، اور اپنی تنقید میں انھوں نے مجھ پر اور پاکستان پر حملے

بھی کے، جن کو صدر مجلس ہونے کے باوجود میں نے نظر انداز کر دیا، تجویز نمبر ۹ کا تعلق بھی انہی بزرگ سے ہے، میری رائے ہے کہ اس تجویز پر عمل کرنے کے لئے ڈاکٹر سلمان صاحب ہی کو کوئی ایک کتاب دینی چاہئے، اگر وہ "فرسٹ کلاس" انگریزی ترجمہ کرنے میں کامیاب ہو گئے تو اس کتاب کی اشاعت کی ذمہ داری میں قبول کرنے کے لئے تیار رہوں،

میری ایک تجویز یہ ہے کہ اس کانفرنس کی ایک مختصر روداد ضرور شائع کرنی چاہئے، اور اس روداد کو نہ صرف مسلمان محققین کو بلکہ جس حد تک ممکن ہو مستشرقین کو بھجوانی چاہئے تاکہ ان کو یہ احساس ہو کہ ان کی فکر و نظر پر گرفت کے لئے ایک ادارہ عالم وجود میں آگیا ہے، اس مختصر روداد میں مقالات نہیں دئے جائیں گے، مگر کانفرنس کا مقصد اور منشاء ضرور واضح کیا جانا چاہئے، اور کانفرنس کی رائے اور عزائم کا اظہار ہونا چاہئے،

"معارف" مجھے ملتا ہے، اپریل کا بھی جلد مل جائے گا،

اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے حفظ وامان میں رکھے،

احترامات فائقہ،

آپ کا مخلص

حکیم محمد سعید

مقالات شبلی جلد ششم

سلسلہ مقالات شبلی آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے، یہ اس سلسلہ کی چھٹی جلد ہے، جس میں مولانا شبلی مرحوم کے وہ معرکۃ الآرا تاریخی مضامین درج ہیں جو انھوں نے عیسائی مشنریوں اور مستشرقین کے رد میں لکھے ہیں مثلاً کتب خانہ اسکندریہ، اسلامی شفاخانے، اسلامی کتب خانے، اور تراجم وغیرہ،

ضخامت : ۲۴۲ صفحے، قیمت : ۱۰ روپے

منیجر

مطبوعات جدیدہ

اعلام النثر والشعر فی العصر العربی الحدیث (الجزء الثانی) مرتبہ مولانا حافظ محمد یوسف کوکن، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۴۶۰، قیمت ۵۷ روپے، پتہ :- حافظ پریس پرنٹرس اینڈ پبلشرس، ۱۳ میلاپور سٹریٹ مدراس، ۱۴،

یہ کتاب ان خطبات کا مجموعہ ہے، جو مولانا محمد یوسف کوکن نے جدید عربی ادب کے موضوع پر کالی کٹ یونیورسٹی میں دیئے تھے، اس کی پہلی جلد پر کئی ماہ قبل معارف میں تبصرہ کیا جا چکا ہے، اب دوسری جلد شائع ہوئی ہے، اس کے شروع میں مہجر (ہجرت گاہ) کے ادیبوں کا تذکرہ ہے، جو خلافتِ عثمانیہ کے آخری دور میں معاشی بدحالی کی وجہ سے مصر، شام، اور لبنان وغیرہ کی سکونت ترک کرکے یورپ کے ملکوں میں جا بسے تھے، اور شمالی و جنوبی امریکہ میں خاص طور پر اُن کی نئی آبادی ہو گئی تھی، اُن میں اکثر مسیحی تھے، مگر وہاں جانے کے بعد بھی انھوں نے عربی زبان و ادب سے اشتغال اور دلچسپی قائم رکھی، اپنے ادارے قائم کرکے اخبار و رسالے نکالے اور کتابیں شائع کیں، لائق مصنف نے اس طرح کے تقریباً ۳۹ اہل قلم کے حالات و واقعاتِ زندگی قلم بند کئے ہیں، اور اُن کے علمی، ادبی، تنقیدی، اور شعری سرمایہ کی قدر و قیمت دکھائی ہے، اس ضمن میں شمالی امریکہ کی ادبی تنظیم الرابطۃ القلمیہ، جنوبی امریکہ کی العصبۃ الاندلسیہ اور ایک اور ادبی انجمن الرابطۃ الادبیہ کے اغراض و مقاصد کا خاکہ پیش کیا ہے، اور اُن کے موسسین اور

سرگرم کارکنوں کا ذکر کیا ہے، آخر میں عربی ملکوں کے بارہ ادیبوں اور شاعروں کے حالات
اور اُن کی ادبی و شعری خدمات کا جائزہ لیا ہے، پہلے حصہ کے ممتاز نام یہ ہیں، امین ریحانی
جبران خلیل جبران، میخائیل نعیمہ، رشید ایوب، ایلیا ابو ماضی، میشال معلوف، الدکتور احمد
زکی ابوشادی وغیرہ، اور دوسرے حصہ میں جمیل صدقی زہاوی، فواد خطیب، معروف
رصافی، محمد کرد علی، اور محمد راغب طباخ وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں، اس کتاب میں جدید
عربی ادب میں ڈرامہ و افسانہ کی ابتدا و ترقی اور کچھ ممتاز ڈرامہ و افسانہ لکھنے والوں کا ذکر
بھی ہے، عربی زبان و ادب کی خدمت و ترقی میں حصہ لینے والے عیسائی مصنفین و اہلِ قلم
کی مساعی بھی دکھائی گئی ہیں، سب سے آخر میں الاستشراق و المستشرقون کے زیرِ عنوان خلفائے
عباسیہ کے زمانہ سے بارہویں صدی ہجری تک کے یہودی و عیسائی فضلاء کے کارنامے بیان
کئے ہیں، اس میں مصنف نے اسلامی علوم پر مشتمل کتابوں کی ترتیب و تحشیہ کے ساتھ اشاعت،
اور اسلام پر اُن کی بعض مفید خدمات کو سراہا ہے، مگر اُن کے تعصب و عناد کا بھی ذکر کیا ہے
اور بتایا ہے کہ انھوں نے آنحضرت صلعم کی ذات گرامی کو خاص طور پر طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا ہے،
اس سلسلہ میں ماضی قریب کے ان مسلمان علماء و فضلاء کا ذکر بھی آگیا ہے، جنھوں نے مستشرقین
کے زہر کا تریاق مہیا کیا، مثلاً سر سید احمد خاں، امیر علی، مولانا شبلی، سید جمال الدین افغانی،
مفتی محمد عبدہ، ڈاکٹر محمد حسین ہیکل اور عباس محمود عقاد، اس کتاب میں جن اہلِ قلم کا تذکرہ ہے،
وہ سب بیسویں صدی کے ہیں، اور بعض اب بھی بقیدِ حیات ہیں، اس کے مطالعہ سے عربی زبان
و ادب کے نئے رجحانات و میلانات اور جدید افکار و تحریکات کے متعلق بھی مفید باتیں
معلوم ہوتی ہیں، مصنف نے مسلمانوں کی طرح عیسائی اور یورپین فضلا کے کمالات اور
ان کی اسلامی علوم اور عربی زبان کی خدمات کا فراخدلی سے اعتراف کیا ہے، اور ان کے

نظریات و خیالات پر بحث و تبصرہ کئے بغیر ان کم و کاست ان کو پیش کیا ہے، انھیں اردو کی
طرح عربی لکھنے پر بھی ابھی قدرت ہے، مگر ایک جگہ فہرستیا (ص ۱۲۱) لکھا ہے، عربی میں ذہین
استعمال نہیں ہوتا، کتابت کی غلطیاں بھی ہیں، اگر وہ مصنفین کے سنین وفات کے اعتبار
سے کتاب مرتب کرتے تو زیادہ بہتر ہوتا،

باقیات ایک جہاں

مرتبہ مولوی ظہیر احمد یاقوی صاحب، متوسط
تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۰۲ مجلد مع گرد پوش،
قیمت چندرہ روپئے پتہ: ادارہ مصنفین انجمن ترقی اردو باقیات صالحات ویلور
جنوبی ہند کا مشہور مدرسہ باقیات الصالحات ویلور تقریباً سوا سو برس (۱۲۵) سے مفید دینی
تعلیمی خدمات انجام دے رہا ہے، زیرِ نظر کتاب میں اسی درسگاہ، اس کے بانی اور دوسرے
سرگرم کارکنوں اور اساتذہ کے متعلق مضامین یکجا کئے گئے ہیں، چند مضامین میں اس درسگاہ
کی خصوصیات اور تعلیمی خدمات وغیرہ کا ذکر ہے، اس سلسلہ کا ایک مضمون دار المصنفین کے سابق
رفیق ڈاکٹر مولانا محمد یوسف کوکن عمری کا بھی ہے، مدرسہ کے بانی مولانا عبد الوہاب ویلوری مرحوم
کا ذکرِ خیر دو مضامین میں ہے، ایک مضمون میں ان کے فرزند اور مدرسہ کے سابق ناظم مولانا
محمد ضیاء الدین مرحوم کا تذکرہ ہے، کئی اور مضامین میں اس گلستانِ علم کے دوسرے رنگ
برنگ پھولوں کا ذکر ہے، بعض حضرات کے انٹرویو بھی درج ہیں، ایک مضمون میں مدرسہ باقیات
کے طلبہ و اساتذہ کی اردو زبان سے دلچسپی بھی دکھائی گئی ہے، اور مدرسہ کے متعلق ملک کے
بعض اکابر کی رائیں اور اس کے صد سالہ جشن کے بارہ میں اُن کے تاثرات بھی نقل کئے گئے
ہیں، آخر میں نظموں کا حصہ ہے، گو مضامین کا معیار زیادہ بلند نہیں ہے، تاہم اس کتاب
سے مدرسہ کی خصوصیات اور اس سے وابستہ اہم اشخاص کے متعلق گوناگوں باتیں معلوم ہوتی

ہیں، جن سے قومی اور ملی کام انجام دینے والے بہت کچھ فائدہ اٹھا سکتے ہیں

ترانہ:- از جناب ابرار اعظمی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ اچھا، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۱۶ - قیمت تحریر نہیں، پتہ:- نونہال تخلیقی اکیڈمی خالص پور اعظم گڈھ،

جناب ابرار اعظمی صاحب نے اپنے دینی، تعلیمی اور ادبی ذوق کی وجہ سے ننھے بچوں اور بچیوں کی مناسب تعلیم و تربیت کے لئے اپنے وطن میں ایک اسکول قائم کیا ہے، اور بچوں کے ذوق کی مفید کتابیں مرتب کرنے کا پروگرام بھی بنایا ہے، یہ انوکھا ترانہ اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے، اسمیں گو تعلیم و تربیت سے زیادہ بچوں کے ذوق و دلچسپی کو مدنظر رکھا گیا ہے، تاہم اس میں اللہ کی عظمت کے ساتھ بعض بنیادی اسلامی عقائد کا ذکر بھی آگیا ہے، اور اس کا لحاظ بھی ہے کہ اس کی مشق سے بچوں کا تلفظ درست ہو، شروع میں علم کی اہمیت اور مسلمانوں کی تعلیم سے غفلت کا ذکر بھی ہے، لیکن اس کا نام "نونہال تخلیقی اکیڈمی" کے بجائے "نونہال تربیتی یا تعلیمی اکیڈمی" رکھنا چاہئے تھا، خلق و تخلیق تو صرف خدا کی شان ہے، افسوس کہ ترقی پسندوں کے اثر سے اسلام پسند حضرات بھی ان لفظوں کو خدا کے بجائے عام انسانوں کے لئے استعمال کرنے میں قباحت محسوس نہیں کرتے،

بچوں کی نظمیں، از جناب جگن ناتھ آزاد، متوسط تقطیع کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ صفحات ۴۴ قیمت ۲ روپیہ، پتہ ترقی اردو بورڈ نئی دہلی

ترقی اردو بورڈ نے بچوں کے ادب کی متعدد کتابیں شائع کی ہیں اب اس نے اردو کے مقبول شاعر اور مشہور ادیب و مصنف جناب جگن ناتھ آزاد کی نظموں کا یہ مجموعہ شائع کیا ہے جو اپنے والد محترم ہی کی طرح بچوں کیلئے اچھی نظمیں کہنے میں شہرت رکھتے ہیں، امید ہے کہ بچے اپنی دلچسپی اور پسند کی ان رنگ برنگ نظموں کو شوق اور دلچسپی سے پڑھیں گے،

"ض"